تفصیل اور اس کی ناکامی کے اسباب بیان کیے ہیں، کتاب کے آخر میں مولانا سندھی کے قلم سے ان کے مختصر خود نوشت حالات ہیں، یہ کتابچہ ہندوستان کی تاریخ آزادی کی اہم کڑی ہے، اور ایک تاریخی یادداشت کی حیثیت سے مطالعہ کے لائق ہے۔

فردوس ۔ از جناب ماہر القادری، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۷۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ: مکتبہ چراغ راہ، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور

لائق مصنف کا شعری و ادبی ذوق تعارف سے مستغنی ہے، وہ مشاق صاحب قلم بھی ہیں اور خوش نوا سخنور بھی، ہر دور میں ان کا مذاق ستھرا رہا ہے، اب اس میں اور زیادہ پاکیزگی آگئی ہے، اور ان کی شاعری نے عاشقانہ رنگین نوائی کے بجائے قومی و ملی مقصدی کی شکل اختیار کر لی ہے، فردوس ان کے کلام کا اسم بامسمی مجموعہ ہے، اس کا بڑا حصہ اخلاقی و اصلاحی نظموں پر مشتمل ہے، کچھ متفرق نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، اور دونوں میں خوش مذاقی اور کہنہ مشقی نمایاں ہے، اخلاقی و اصلاحی نظمیں محاسن شعری سے آراستہ اور تغزل کا رنگ بڑا ستھرا اور پاکیزہ ہے، مصنف کی خوش مذاقی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس مجموعہ کو ہر قسم کے تعارف سے پاک رکھا ہے اور کلام کے متعلق فیصلہ ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔

گنج طلسم ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر محمد حفیظ سید، تقطیع بڑی، ضخامت ۳۳ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت تحریر نہیں، پتہ: سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدر آباد، دکن۔

شاہ نعمت اللہ ولی دکن کے قطب شاہی سلاطین کے زمانہ کے ایک صاحب دل درویش اور صوفی شاعر تھے، ان کا مزار اور خانقاہ اب تک گولکنڈہ میں موجود ہے، انھوں نے گنج طلسم کے نام سے ایک عارفانہ مثنوی فارسی میں لکھی تھی، جو اب نایاب ہے، ڈاکٹر حفیظ سید صاحب کو حسن اتفاق سے اس کا ایک عمدہ نسخہ مل گیا، وہ خود صوفی مشرب اور صوفیانہ کلام کے بڑے شائق اور دلدادہ ہیں، اس لیے انھوں نے اس مثنوی کو مع اردو ترجمہ کے مرتب اور ادارہ ادبیات اردو نے اس کو شائع کیا ہے، مثنوی اخلاقی مسائل اور عارفانہ معارف و حقائق پر مشتمل ہے، جن لوگوں کو صوفیانہ شاعری سے ذوق ہو ان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

"م"

جلد ۷۸ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۶ء عدد ۳

فہرست مضامین

شذرات

ایک عرصہ سے مسلمانوں کے مذہب، ان کے پیغمبر، ان کی مقدس کتاب اور ان کے اکابر کی توہین کا مستقل سلسلہ قائم ہے، ہر تھوڑے دنوں کے بعد اس قسم کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے، اور مسلمانوں کی دل آزاری مستقل مشغلہ بن گئی ہے، حال میں بھارتیہ ودیا بھون بمبئی سے ایک انگریزی کتاب "بیاگرفی آف ریلیجس لیڈرس" شائع ہوئی ہے، یہ اپنی بیہودگی میں سب سے بڑھ گئی، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات کی شان میں ایسے ناشایستہ اور گستاخانہ کلمات استعمال کیے گئے ہیں، جن کا استعمال معمولی انسانوں کے لیے بھی نازیبا ہے، نہ کہ ذات پاک نبوی اور آپ کی ازواج مطہرات کے لیے، جو ساری دنیا کے لیے واجب الاحترام ہیں، اور جن کی عظمت و محبت مسلمانوں کی سب سے بڑی ایمانی دولت ہے، یہ الفاظ اس درجہ ناشایستہ اور نفرت انگیز ہیں کہ سنجیدہ غیر مسلم بھی اس کو گوارا نہیں کر سکتے، چنانچہ انھوں نے بھی اظہار بیزاری کیا ہے اور مسلمان تو ان کو پڑھ کر مشکل سے ضبط کر سکتا ہے، اس فتنہ انگیزی کا مقصد مسلمانوں کی دل آزاری کے سوا اور کچھ نہیں، جو کسی حیثیت سے بھی مناسب نہیں،

اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہتے ہیں، اور محض احتجاج سے ان کا انسداد نہیں ہو سکتا، اس کے لیے جیسا کہ پہلے بھی تحریک ہو چکی ہے، پیشوایان دین کی توہین کی دفعات کو زیادہ وسیع اور سخت بنانے کی ضرورت ہے، ابھی چند ہی مہینے ہوئے، جب لکھنؤ میں اس قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا، یہ سوال اٹھایا گیا تھا، مگر پھر کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں کی، یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں، بلکہ تمام فرقوں کا معاملہ ہے، اگر آج مسلمانوں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے، تو کل دوسرے فرقوں کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے اور

اس قسم کی فتنہ انگیزی جس سے مختلف فرقوں میں نفاق اور بدامنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، حکومت کے مصالح کے بھی خلاف ہے، اس لیے جلد سے جلد ایسا قانون بنانے کی ضرورت ہے، جس سے پھر کسی گستاخ کو اس قسم کی جرأت نہ ہو، ورنہ آئے دن اس قسم کے واقعات پیش آتے رہیں گے جن کے نتائج خطرناک ہوں گے، اس وقت سب سے مقدم کام یہ ہے کہ یہ کتاب فوراً ضبط کر لی جائے اور اس کے ناشرین پر مقدمہ چلایا جائے، اس بارہ میں تمام مسلمانوں کے جذبات و خیالات متحد ہیں،

افسوس ہے کہ غلام محمد صاحب سابق گورنر جنرل پاکستان نے ایک طویل علالت کے بعد انتقال کیا، وہ نہ صرف اپنے عہدہ بلکہ دل و دماغ کے لحاظ سے بھی اس دور کے نامور لوگوں میں تھے، خصوصاً مالیات کے بڑے ماہر تھے، ایک زمانہ میں حکومت ہند اور ریاست حیدرآباد میں فنانس کے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے تھے، اور ہر جگہ اپنی مہارت فن کا ثبوت دیا، پاکستان کی گورنر جنرلی کے زمانہ میں ان کی سیاسی اور دماغی قابلیتیں نمایاں ہوئیں، چنانچہ انھوں نے بڑے نازک موقعوں پر پاکستان کی حکومت کو اپنی ہوشمندی اور قوت سے خطرات سے بچایا اور اسکے استحکام کی کوشش کی، گو انکے بعض اقدام آمرانہ تھے لیکن پاکستان جیسے ڈانواں ڈول سیاست والے ملک کے لیے ایسے ہی مضبوط لیڈر بلکہ ایک اچھے ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے، اسکے بغیر اس کو استحکام نہیں ہو سکتا، ان قابلیتوں کے ساتھ انکی ذات مختلف حیثیتوں سے بڑی غنیمت تھی، وہ پنجابی تھے لیکن انکی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی تھی، پھر ملازمت کے سلسلہ میں عرصہ تک دلی اور لکھنؤ میں رہے، اس لیے اس صوبہ کے لوگوں سے ان کے بڑے تعلقات تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی ان کے دوستوں میں تھے، اسلیے قدرۃً اسکا اثر دونوں ملکوں کی سیاست پر بھی پڑتا تھا، چنانچہ غلام محمد صاحب مرحوم کی گورنر جنرلی کے زمانہ میں دونوں ملک، ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے جس کی توقع نئے اور اجنبی لوگوں سے نہیں ہو سکتی، مذہبی حیثیت سے راسخ العقیدہ بلکہ خوش عقیدہ مسلمان تھے، حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے، حاجی وارث علی قدس سرہ سے انکو بڑی

عقیدت تھی، چنانچہ اپنی گورنرجنرلی کے زمانہ میں بھی وہ ان کے مزار کی زیارت کے لیے دیوہ آئے تھے، ان میں پرانی تہذیب کی بہت سی خوبیاں تھیں، وہ ایک عرصہ سے فالج میں مبتلا تھے، نقل و حرکت سے بالکل معذور ہو گئے تھے، زبان بھی پوری طرح کام نہ دیتی تھی، لیکن دماغ اس حالت میں بھی پورا کام کرتا تھا، اور انھوں نے اس معذوری کے زمانہ میں جو کارنامے انجام دیے وہ بہت تندرست بھی مشکل سے انجام دے سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ محمدؐ کے اس غلام کو ان کے طفیل میں عالم آخرت کی سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے۔

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی وفات کی خبر ملی، مرحوم ملک و ملت کے پرانے خدمت گذار، مجلس احرار کے مشہور لیڈر اور جنگ آزادی کے ممتاز مجاہدین میں تھے، اور اس راہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، کانگریس سے انکا تعلق بہت قدیم تھا، جو ہر زمانہ میں برابر قائم رہا، ہندوستان کی تقسیم اور اپنے وطن لدھیانہ کی تباہی کے بعد دلی میں متوطن ہو گئے تھے، انکی عمر کا بڑا حصہ قوم و ملک کی خدمت میں گذرا، طبعاً بڑے خاکسار، متواضع، فیاض اور مہمان نواز تھے، دار المصنفین کے لوگوں سے بڑا اخلاص رکھتے تھے، جب شرقی اضلاع کیجانب آنا ہوتا تھا تو دار المصنفین ضرور آتے تھے، انکی صحت عرصہ سے خراب تھی، ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے آنتوں کا اپریشن ہوا تھا، اس سے تو صحتیاب ہو گئے تھے، مگر ۲ ستمبر کو قلب کا دورہ پڑا اور دفعۃً انتقال کر گئے، اللہ تعالیٰ اس پرانے خادم قوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

یہ عجیب بات اور اردو کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ وہ اپنے اصل وطن سے تو نکالی جا رہی ہے مگر دوسرے صوبوں سے اسکی تائید و حمایت کی آوازیں برابر بلند ہوتی رہتی ہیں، پنجاب کی تو اردو ثانوی زبان ہے، اسلیے اسکی حمایت تو عجیب نہیں، مگر راجستھان، مدراس، اور آندھرا وغیرہ سے اسکی پرزور حمایت یقیناً اسکے لیے بہت امید افزا ہے، اور اس کا ثبوت ہے کہ اردو پورے ہندوستان کی مشترک زبان ہے، اس پر ان صوبوں کے اردو کے کنونشن اور کانفرنسیں شاہد ہیں، خصوصاً آل انڈیا آندھرا اردو کانفرنس کا ڈاکٹر ستیہ وادیہ کا خطبۂ صدارت تو اردو کی تاریخ اور اسکی اہمیت پر ایک فاضلانہ مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ خطبہ اردو کے بہت سے اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، اور اس لائق ہے کہ اسکو مستقل کتابی شکل میں چھاپا جائے۔

مقالات

اسلامی قانونِ اجرت کا ایک باب

از جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

(۳)

اسلامی معیار اجرت

اسلامی نقطۂ نظر سے بھی مزدوروں کی اجرت کا معیار اجرت متعارفہ نہیں، بلکہ اجرت صحیحہ ہے، یعنی ان کو اتنی اجرت ملنی چاہیے جس سے ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں، انکی بنیادی ضرورتیں محض غذا، لباس اور مکان ہی نہیں بلکہ علاج اور تعلیم بھی ہے، اگرچہ علاج اور تعلیم کی ذمہ دار خود حکومت ہوگی اور وہی اس کے لیے پالیسی بنائے گی اور اس کو عملاً نافذ کرے گی،[1] مگر مزدوروں کی اجرت میں اتنی وسعت بہرحال ملحوظ رکھی جائے گی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق سرکاری درسگاہوں کے بجائے پرائیوٹ اداروں میں تعلیم دلائیں، اور سرکاری شفاخانوں کے بجائے پرائیوٹ ڈاکٹر کو بلا کر اپنے گھر پر علاج کرائیں، اس کے لیے ان کو پورا موقع بھی موجود ہونا چاہیے اور جیب میں پیسہ بھی،

اس سلسلے میں حسب ذیل احادیث نبوی اور آثار صحابہ رہنمائی کرتے ہیں، ایک بار حضرت

---

[1] علاج اور تعلیم کے بارے میں حکومت کی بنیادی پالیسی تو بہرحال ہر شخص کو تسلیم کرنی پڑے گی، اگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ حکومت کی قائم کردہ تعلیم گاہوں اور اسپتالوں میں داخلہ پر مجبور بھی ہو، اس میں بہرحال اسکو آزادی ہوگی،

ابوذر غفاریؓ نے کسی عجمی غلام کو برا بھلا کہا، غلام نے جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپ نے ابوذرؓ کو تنبیہ فرمائی کہ تم میں ابتک جاہلیت باقی ہے، انھوں نے فرمایا، یا رسول اللہ کیا اس بڑھاپے میں، فرمایا ہاں، اس کے بعد آپ نے فرمایا۔

هم اخوانكم جعل الله تحت ايديكم	یہ تمھارے بھائی ہیں، خدا نے انکو تمھارے ماتحت
فمن جعل الله اخاه تحت يديه	کیا ہو تو جس کے ماتحت خدا نے اسکے کسی بھائی کو کیا ہے
فيطعمه مما ياكل وليلبسه مما يلبس[1]	اسے چاہیے کہ جو وہ خود کھائے وہ انکو کھلائے اور جو [illegible]

اس کے بعد حضرت ابوذرؓ کا یہ حال ہوگیا کہ ان کے پاس ..... ایک چادر بھی آجاتی تھی تو نصف اپنے خادم کو دیدیا کرتے تھے اور نصف خود استعمال کرتے تھے،

دوسری حدیث میں ہے کہ "جن سے تم کام لیتے ہو ان کی غذا اور لباس کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے"۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ میرے پاس ایک دینار ہے، آپ نے فرمایا کہ اپنی بیوی کے اوپر صرف کرو، پھر پوچھا کہ ایک دینار اور ہے، فرمایا اپنے بچوں پر صرف کرو، انھوں نے کہا کہ ایک دینار اور ہے، کہا اپنے خادم پر صرف کرو، یعنی آپنے جہاں اس کے مال میں بیوی بچوں کا حق مقرر کیا اسی کے ساتھ ان لوگوں کا حق بھی مقرر فرمایا جو ان کے ہاں محنت مزدوری کرتے ہیں، انھوں نے آخر میں کہا کہ میرے پاس ایک دینار اور ہے، آپنے فرمایا کہ اس کو اپنی صوابدید سے جہاں چاہو خرچ کرو۔

ایک بار حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے عمال حکومت کو ہدایت دی کہ جو لوگ مقروض ہوں ان کے قرض حکومت کے بیت المال سے ادا کر دیے جائیں، عمال حکومت نے انھیں لکھا کہ ایسے لوگ بھی اس فہرست میں آتے ہیں، جن کے مکان بھی ہے، سواری بھی ہے، گھر کے اندر ساز و سامان

[1] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی عن السباب واللعان

بھی موجود ہے، اور کھانے پینے کی چیزیں بھی، کیا ایسے لوگوں کا قرض ادا کرنا صحیح ہوگا، آپ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ یہ چیزیں ہر مسلمان کے لیے لازمۂ حیات ہیں، ان چیزوں کے باوجود اگر وہ مقروض ہیں تو

فاقضوا عنه فانه غارم[1]	ان کا قرض ادا کر دو کہ یہ مقروض ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت کے ایک آباد کار کے لیے خواہ وہ مزدور ہو یا کسان یہ چیزیں بہرحال فراہم ہونی چاہئیں، اور آجر کو اجرت دیتے وقت اس کا لحاظ کرنا پڑے گا، اسلیے کہ اگر اس کی اجرت میں اس کا لحاظ نہیں کیا جائے گا تو پھر اس کی یہ ضرورتیں کیسے پوری ہو سکتی ہیں،

علاج و تعلیم کے سلسلے میں قرآن کی آیات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپکے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھا جائے تو اس کی اہمیت خود بخود سامنے آجائے گی،

قرآن مجید نے مرض کو اتنی اہمیت دی ہے کہ بیماری کی حالت میں بہت سے احکام کی پابندی اٹھالی ہے، حتی کہ جہاد جو افضل العبادات ہے، اسکی ذمہ داری اس حالت میں ساقط کر دی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود مریضوں کی عیادت اور تیمارداری فرماتے تھے، اور لوگوں کو اس کی ترغیب دیتے تھے، آپنے بارہا لوگوں کو اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے،

امام ابن قیم لکھتے ہیں،

من هديه صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ تھا کہ
فعل التداوي في نفسه والامر	آپ نے خود علاج کرایا ہے اور دوسروں
لمن اصابه مرض[2]	کو اس کا حکم دیا ہے،

[1] کتاب الاموال ص ۵۵۶، عمرؓ بن عبدالعزیز کا یہ اسوہ ابوعبید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفسیر میں نقل کیا ہے انما الصدقة عن ظهر غنى یعنی زکوٰۃ مالدار پر واجب ہے اور محض بنیادی ضرورتیں رکھنے والا آدمی مالدار نہیں کہا جا سکتا،
[2] الطب النبویؐ ص ۶

اسلامی معاشرہ کے افراد کے لیے آپ نے جو چھ چیزیں ضروری قرار دی ہیں ان میں ایک عیادتِ مریض بھی ہے،

ایک بار آپ نے فرمایا کہ تم میں سے آج مسکین کو کس نے کھانا کھلایا ہے، تم میں سے آج مریض کی عیادت کس نے کی ہے، حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کی زبان سے ہر ہر سوال کے جواب میں "ہاں" نکلی، آپ نے فرمایا کہ یہ سب چیزیں جس شخص میں جمع ہو جائیں وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا،[1]

ایک بار حضرت کعبؓ بن مالک بیمار پڑے تو آپ نے ایک طبیب کو بھیجا جس نے آپ کا علاج کیا،[2]

ایک حدیث میں ہے،

من طبب ولم يعلم منه طب قبل ذالك فهو ضامن[3]	جو شخص پہلے سے علاج میں مہارت حاصل نہ کرے وہ کسی کا علاج کرے اور اس کو نقصان پہنچے تو اس سے تاوان لیا جائے گا،

غالباً اسی ارشادِ نبوی کو سامنے رکھکر خلفا ر سے نے معالجوں کی نگرانی کو بھی اپنے ذمے لیا تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی،

حضرت عمرؓ اس پر اتنی سختی سے عمل کیا کرتے تھے کہ جو عامل یا حاکم غلاموں اور خادموں کی عیادت نہیں کرتا تھا، اس کو معزول کر دیتے تھے،[4]

اسی طرح تعلیم کے سلسلے میں بھی قرآن کی ہدایتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور خلفائے راشدین کے اسوے سامنے ہوں تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ انسان کی بنیادی ضرورتوں

[1] مسلم باب الزکوٰۃ باب من جمع الصدقۃ و اعمال البر [2] مسند احمد ج ۳ ص ۱۸ [3] مشکوٰۃ کتاب الطب، اسکو حاکم نے مستدرک میں اور دارقطنی اور نسائی نے اپنی اپنی سنن میں نقل کیا ہے، ابو داؤد نے بھی اس روایت کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے مگر اسکی صحت کے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے [4] معاشی نظریے ج ۲ ص ۳۰۷

میں ایک خاص ضرورت تعلیم بھی ہے، آپ نے علم کے حصول کو ایک فرض قرار دیا ہے

طلب العلم فريضة	علم کی طلب فرض ہے،

آپ نے صحابہ کو تعلیم کے لیے متعدد مقامات پر روانہ فرمایا تھا، خلفائے راشدین نے تعلیم کو حکومت کی ایک ذمہ داری قرار دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ خود بیت المال سے انھوں نے اس کا انتظام کیا تھا، صرف مدینہ کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ

ثلثة فی المدينة يعلمون الصبيان وكان عمر بن الخطاب يرزق كل واحد منهم خمسة عشر درهماً فی كل شهر[1]	تین آدمی مدینہ میں بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور حضرت عمرؓ نے پندرہ درہم ماہانہ ان کی تنخواہ مقرر کر دی تھی،

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ اسلامی نظام اجرت میں مزدوروں کو اتنی اجرت بہرحال ملنی چاہیے جس کے ذریعہ وہ محض اپنے جسم و جان کا رشتہ ہی قائم نہ رکھ سکیں بلکہ اس کے ذریعہ (۱) غذا (۲) لباس (۳) مکان (۴) علاج (۵) اور تعلیم کا بھی انتظام کر سکیں، لیکن جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، مزدوروں کو ایک متوازن اجرت صحیح اسی وقت مل سکتی ہے جب ملک کی عام معاشی حالت میں استقلال اور اس کی صنعت و تجارت میں توازن ہو، اگر یہ چیز نہ ہوگی تو پھر اجرت صحیح میں پائیداری نہیں پیدا ہو سکتی اور مزدوروں میں لامحالہ بے چینی پیدا ہوگی، اسی طرح اوپر اس کا بھی ذکر آچکا ہے کہ اگر مزدوروں کی اجرت صحیح کی مقدار میں برابر اضافہ ہوتا رہے اور وہ تعیشات میں مبتلا ہو جائیں تو بھی کارکردگی پر اس کا اثر پڑے گا، جس سے ملک کی صنعت و تجارت اور معاشرت کو نقصان پہنچے گا،

اسلام نے اجرت صحیح کو قائم رکھنے اور لوگوں کو تعیشات سے بچانے کے لیے جو تدابیر اختیار

[1] کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۲

کی ہیں وہ اخلاقی بھی ہیں اور قانونی بھی، وہ ایک طرف انسانوں میں خوف خدا اور خوف آخرت کے ذریعہ ایسی اخلاقی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں مفاد پرستی، نفع اندوزی، خود غرضی اور ہوا و ہوس کے بجائے اخوت، ہمدردی اور قناعت پسندی کے جذبات پیدا ہوں، دوسری طرف ملک کے اندر ایک معتدل نظام معیشت قائم کرکے دولت کی غلط تقسیم کو مٹاتا ہے، اور قانوناً ایسے تمام ذرائع معاش بند کر دیتا ہے، جن سے انسانی اخلاق اور معاشرت پر برا اثر پڑتا ہو، مثلاً ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی وغیرہ، اور آجروں میں وہ ایسی ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اجیروں پر ظلم و ستم اور ان کی حق تلفی کرنے کے بجائے ان کو اپنا جیسا انسان سمجھکر ان سے معاہدہ کرتے وقت یہ کہتے ہیں کہ

وما ارید ان اشق علیک ستجدنی انشاء اللہ من الصالحین	میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی زیادتی ہو، اس سلسلہ میں انشاء اللہ تم مجھے اچھا آدمی پاؤ گے۔

ان کے دلوں میں خدا اور آخرت کا خوف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہوتا ہے،

آپ نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن جن تین آدمیوں کے خلاف مدعی ہوں گا ان میں

رجل استاجر اجیرا فاستوفی منه ولم یعطه اجره[1]	ایک وہ شخص جس نے کوئی مزدور رکھا اور اس مزدور نے اسکا کام پورا کر لیا مگر اس نے اس کی اجرت کاٹ لی یا بالکل نہ دی،

ان کے سامنے ان ظالم آجروں کے بجائے جو مزدوروں کی اجرت مارنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، ان آجروں کی مثالیں سامنے ہوں گی جو اجرت کے امین ہوتے ہیں، آپ نے ایک بار فرمایا کہ تین آدمی ایک غار میں پھنس گئے تھے، ان تینوں نے اپنے اپنے نیک کاموں کا واسطہ دیکر

[1] بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب الاجارات

اس مصیبت سے نجات کی دعا کی، تیسرا جس کی دعا کے بعد یہ لوگ اس مصیبت سے نجات پا گئے وہ ایک آجر تھا، جس نے کسی مزدور کو اجرت پر رکھا تھا، اتفاق سے وہ مزدور کام پورا کرنے کے بعد اپنی اجرت لیے بغیر چلا گیا، اس آجر نے اس کی اجرت کو ٹھرکے جانے کے بجائے تجارت میں لگا دیا، اور اس میں اس کو کافی نفع ہوا، بہت دنوں کے بعد جب وہ مزدور واپس آیا اور اس نے اپنی اجرت طلب کی تو آجر نے کہا کہ یہ تمام جانور، مال اور اسباب جو نظر آرہا ہے وہ سب تمھاری اجرت ہے، پہلے تو وہ اس کو مذاق سمجھا، مگر جب اس نے اس کو یقین دلایا تو وہ یہ سارا سامان لیکر گھر واپس گیا،[1]

اسلام ان کارکنوں اور مالکوں کو جو مزدوروں، اجیروں اور ملازموں پر زیادتی کرتے ہیں یہ وعید سناتا ہے کہ

لا یدخل الجنة سئ الملکه	اپنے ماتحتوں سے برے برتاؤ کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا،

آپ نے اپنی آخری وصیت میں یہ فرمایا کہ

اتقوا اللہ فیما ملکت ایمانکم (ابوداؤد)	اللہ نے جن کو تمھاری ماتحتی میں دیا ہے ان کے بارے میں خدا سے ڈرو،

مقصد یہ ہے کہ ان کے حقوق کا پورا خیال رکھو، گو یہ حدیث غلاموں اور ذاتی ملازموں کے بارے میں وارد ہوئی ہے، مگر اس کے باوجود اس کے مفہوم و مدلول کی عمومیت میں کوئی فرق نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ امام توربشتی نے اس حدیث کے تحت ان محنت کش جانوروں کو بھی داخل کیا ہے، جس سے آدمی کام لیتا ہے، اس لیے اس عمومیت میں مزدور اور اجیر بدرجۂ اولیٰ شامل ہوں گے،

[1] ریاض الصالحین باب النیة والاخلاص

اس سلسلہ میں دوسری بات جس کا ذکر اوپر بھی آچکا ہو کہ اسوقت ملک کا اجرت پیشہ اور مظلوم طبقہ یہی تھا، اس لیے آپ نے بار بار اس طبقہ کا تذکرہ فرمایا ہے۔

وہ مزدوروں اور اجیروں کے ذہن میں بھی یہ بات بٹھاتا ہے کہ انھوں نے آجر سے معاہدہ کرکے جو کام اپنے ذمہ لیا ہے، اس کی تکمیل محض مفاد پرستی اور نفع اندوزی اور خودغرضی کے جذبہ سے نہ ہونی چاہیے بلکہ معاہدہ کے بعد ان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لیے القوی الامین ثابت ہوں، اور یہ سمجھکر کام کریں کہ یہ معاہدہ انھوں نے محض آجر سے نہیں بلکہ خدا سے کیا ہے، جو معاہدہ شکنی یا اس میں بددیانتی کو اخلاقی اور قانونی دونوں طرح کا جرم قرار دیتا ہے، معاہدہ کرتے وقت تم کو یہ سوچ کر معاہدہ کرنا چاہیے کہ

والله علی ما نقول وکیل — میں جو معاہدہ کر رہا ہوں خدا اس کا نگراں ہے،

اس لیے اگر آجر کی نگاہوں اور اس کی نگرانی سے بچ گئے تو خدا کی نظروں سے نہ بچ سکیں گے۔

وہ صنعت کاروں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایسا سامان نہ بنائیں جن سے ان کو تو فائدہ ہو، مگر انسانی زندگی کے لیے مفید نہ ہوں، ان کے سامنے یہ اصول پیش کرتا ہے کہ

من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ — آدمی کے اسلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بے ضرورت کام چھوڑ دے،

سٹہ بازوں اور ذخیرہ اندوزوں کو یہ وعید سناتا ہے کہ

المحتکر ملعون — ذخیرہ اندوز ملعون ہے،

من غش فلیس منا — جو کاروبار میں دھوکہ کرتا ہے وہ مسلمان نہیں ہے،

وہ دولت پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے، مگر مسرفانہ اور عیش پرستانہ زندگی بسر کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیتا ہے،

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین — جو لوگ عیش و عشرت کی مسرفانہ زندگی بسر کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں،

اس کے بجائے وہ ایک خدا پرست کی یہ صفت بتاتا ہے کہ

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما — جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں، ان دونوں کے بیچ میں ایک درمیانی راستہ ہے،

مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اسلام نے محض ان اخلاقی تعلیمات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے لیے قانون بھی بنایا ہے۔ اس کی تفصیل حکومت کے فرائض کے سلسلہ میں آئے گی۔

غرض یہ کہ اسلام اس طریقہ سے اجیر و مستاجر کی کشمکش کو ختم کرتا ہے۔ اشیا کی قیمتوں میں یکسانی پیدا کرتا ہے، اجرت صحیحہ کے معیار میں زیادتی اور مسرفانہ تعیشات کو مٹا کر ایک سادہ اور معتدل زندگی کو رواج دیتا ہے،

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام مطلق زیب و زینت اور سامان تفریح کو پسند نہیں کرتا، بلکہ اس کو اس حد سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہتا جو ملک کی معاش، اخلاق اور صحت پر اثر انداز ہو، ورنہ اعتدال و سلامت روی کے ساتھ زیب و زینت اور زیبائش و آرائش کی بھی اجازت دیتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے،

اگر اللہ نے تمھیں کوئی نعمت دی ہے تو اس کا اثر تمھارے اوپر ظاہر ہونا چاہیے، مگر لاتسرفوا کے قید کے ساتھ جس میں اسراف اور غیر معتدل تعیش نہ ہو،

معیار زندگی کی بحث | اس تفصیل کے بعد اس چیز کے بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ مزدوروں کی اجرت صحیحہ کی مقدار اور ان کا معیار زندگی کیا اور کیسا ہو، اسلام نے کچھ حدود مقرر کر دیے ہیں، اور ان حدود کے اندر اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنا معیار زندگی جتنا چاہیں اونچا کریں،

وہ جو قانون بھی بناتا ہے، اس میں یکسانیت ہوتی ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے معیار زندگی کیا ہونا چاہیے؟
اس سلسلہ میں مشہور عالم معاشیات پروفیسر الیاس برنی صاحب کی رائے یہاں نقل کرتے ہیں،

اس مسئلہ میں ازحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے زندگی کا کونسا معیار بہتر ہے، آیا یہ کہ چند سیدھی سادی ضروریات پر قناعت کرنا اچھا ہوگا یا دنیا کی نعمتوں اور تعیشات سے دل بھر کر لطف اٹھانا، حکماء کے ایک طبقہ نے تو نفس پروری اور عشرت پرستی کو زندگی کی غرض و غایت قرار دیا ہے، اور دوسرے نے نفس کشی اور ریاضت کو اعلیٰ مقصد[1] ٹھہرایا ہے، سچ پوچھیے تو یہ فرقے افراط و تفریط میں جا پھنسے، خدا کی بیشمار عطیات سے خواہ مخواہ دست کش رہنا بھی کفران نعمت ہے، اور تمام عمر تن پروری کی نذر کر دینا بھی گمراہی ہے، دنیا کی لذتوں کا اعتدال سے لطف اٹھانا اور پھر بھی نفس پر قابو رکھنا گو دشوار سہی لیکن زندگی کا سب سے کامیاب طریق یہی ہے، اور اسلام نے اپنے پیرؤں کو اسی طریق کی ہدایت کی ہے، مذہبی اور اخلاقی پہلو سے قطع نظر کرکے یہی طریق اعتدال معاشی نقطۂ نظر سے اصولاً تجربۃً بہترین ثابت ہو رہا ہے[2]۔

موجودہ معاشیات کی بیماری موجودہ علمائے معاشیات نے جن معاشی مسائل کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا ہے ان میں ایک معیار زندگی اور اس سے اجرت کا تعلق بھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے فکر کی بنیاد مفروضات پر رکھتے ہیں، اسی سلسلہ میں ان کی بنیادی غلطیاں یہ ہیں،

۱- وہ معیار زندگی کا ایک فرضی نقشہ اپنے ذہن میں رکھتے ہیں، یا پھر ایک مصنوعی معیار زندگی کو

[1] موجودہ دنیا میں اس مقصد کے ماننے والے اب بہت محدود تعداد میں رہ گئے ہیں اسوقت دنیا کی ۹۹ فیصدی آبادی تن پروری اور عیش پرستی ہی کو اعلیٰ ترین مقصد بنائے ہوئے ہے اور اس کی زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

[2] علم المعیشت باب حرف و دولت ص ۷۰

جسے وہ اپنے حظ نفس کے تحت بڑھاتے رہتے ہیں، معیار بنا کر مزدوروں کی اجرت کی تعیین اور اسکے اضافہ پر بحث شروع کر دیتے ہیں، مگر جس چیز پر انھوں نے اس کی بنیاد رکھی ہے وہ چونکہ خود فرضی اور غیر حقیقی ہے، اس لیے ان کے سارے نتائج فکر یا تو محض فلسفہ ہو کر رہ جاتے ہیں جن کو زندگی کے عملی اور تجرباتی پہلو سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا، یا پھر ایک مصنوعی معیار زندگی وجود میں آجاتا ہے جس سے دوسری معاشی اور معاشرتی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، جن کا اعتراف خود ان کو بھی ہے، حالانکہ اس بارے میں فرضی اور مصنوعی معیار زندگی کے بجائے وہ انسان کی واقعی اور حقیقی ضرورتوں کو بنیاد بناتے تو ان کے لیے اس کا فیصلہ کرنا بھی آسان ہو جاتا اور ان الجھنوں سے بھی نجات پا جاتے جن میں وہ اس وقت مبتلا ہیں،

۲- دوسری غلطی یہ ہے کہ معیار زندگی کے بارے میں ان کا یہ تصور ہے کہ وہ مستقل بالذات اور براہ راست زندگی کو خوشحال بنانے والی چیز ہے، حالانکہ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ معیار زندگی بسا اوقات زندگی بنانے اور سنوارنے کے بجائے بگاڑنے کا سبب بن جاتا ہے، جیسا کہ مزدوروں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اگر ان کا معیار زندگی بہت بڑھا تو تعیشات میں مبتلا ہو جائیں گے،

اگر وہ معیار زندگی کو خود موثر بالذات سمجھنے کے بجائے اس کو اضافی چیز سمجھتے اور اس کی تعیین ضرورت اور حاجت کے تحت مقرر کرتے تو ان کی رائے میں یہ تضاد پیدا نہ ہوتا، مگر یہ لوگ انسانی اخلاق کو تو آسانی سے اضافی قرار دیدیتے ہیں، مگر پیٹ کے کسی مسئلہ کو اضافی نہیں قرار دے سکتے خواہ اس سے کتنا ہی الجھاؤ پیدا ہو جائے،

مسٹر ٹاسگ بھی اس غلطی کا اعتراف کرتے ہیں، مگر ان کے سامنے دوسرا کوئی واضح نقشہ نہیں ہے، اس لیے یہ لکھکر اپنا فرض ادا کر دیتے ہیں کہ

وہ بھی (یعنی علمائے معاشیات) اس مغالطہ میں مبتلا ہیں، چنانچہ انھوں نے معیار زندگی پر

اس طرح سے بحث کی ہے گویا وہ براہ راست اثر ڈالنے والا عامل ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے
وہ محض بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔[1]

اس غلطی کا اثر موجودہ دور کے مزدوروں کے اس بڑے طبقہ پر بھی پڑا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں
کہ معیار زندگی کی بلندی ہی پر ان کی اجرت کی زیادتی اور خوش حالی کا دار و مدار ہے، اور ادنیٰ
اور اوسط درجہ کی زندگی ان کے لیے مضر اور نقصان دہ ہے، حالانکہ یہ خیال ایک شدید مغالطہ ہے،
اس بارے میں مزدوروں کے ہمدرد اور وکیل مسٹر ٹاسگ لکھتے ہیں:

معیار زندگی کے بارے میں عجیب و غریب مغالطے ہیں، اوپر کے طبقہ کے مزدوروں میں
یہ خیال عام طور سے پایا جاتا ہے کہ ادنیٰ طرز بود و باش ان کے لیے مضر ہے اور شاہ خرچ
ہونا مفید ہے، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر وہ کفایت شعاری سے کام لیں مثلاً ارزاں غذا
استعمال کریں تو وہ کار آمد نہ رہیں گے اور ان کی اجرت میں کمی ہو جائے گی، اسکے برخلاف
اگر وہ خوش حالی کے ساتھ بسر کریں تو ان کی اعلیٰ اجرت قائم رہے گی، اسی وجہ سے
ایسے اشخاص کے متعلق جو یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اشیاے خورد و نوش اور استعمال کرنے
کے طریقوں میں کفایت ہونی چاہیے، یہ شبہہ کیا جاتا ہے کہ ان کی اجرت کم کرنے کی سازش
میں پوشیدہ طور سے ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

لیکن اس سے زیادہ خام خیالی اور غیر معقول بات اور کچھ نہیں ہو سکتی، اگر آمدنی
سے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کا طریق اختیار کیا جائے یعنی مصارف
کی تنظیم اس طرح عمل میں لائی جائے کہ مصارف کی ہر اکائی سے زیادہ سے زیادہ افادہ
حاصل ہو تو اس سے ان قوتوں کا زور بڑھ جاتا ہے جن پر خوش حالی کی اساس قائم ہے۔"[2]

---

[1] ج ۲ ص ۳۴۲ اردو ترجمہ [2] اصول معاشیات ج ۲ ص ۳۴۲

اوپر اسلامی معیار اجرت کی جو تفصیل کی گئی ہے، اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں
جو موجودہ دور کے مروجہ نظام اجرت میں پائی جاتی ہیں جس کی طرف مسٹر ٹاسگ نے بھی اشارہ کیا ہے،
اسلام نے فرضی یا مصنوعی اور محض حظ نفس کے بجائے انسان کی بنیادی ضرورتوں کے پیش نظر
معیار زندگی مقرر کرنے کی ترغیب دی ہے، اور اس کے کچھ حدود مقرر کر دیے ہیں، جو نہ صرف مزدوروں
بلکہ تمام باشندگان ملک کے لیے یکساں ہیں، اس نے کسی رائج معیار زندگی کو موثر بالذات اور مزدوروں
کی اجرت کا معیار نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو ایک اضافی چیز قرار دیا ہے، اس بنا پر جب وہ مزدوروں کو
کفایت شعاری کی ترغیب دیتا ہے تو ان کو یہ شبہہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ان کی اجرت میں کمی کی سازش
کی جا رہی ہے، (کیونکہ یہ مطالبہ سارے ملک سے ہوگا) اور نہ ان کو خواہ مخواہ ایک مصنوعی معیار زندگی
کی طرف لپکنے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز طریقے اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئیگی،
اس لیے کہ دولت میں کمی اور زیادتی کے باوجود نہ تو ان کی کوئی معاشی ضرورت رکے گی، اور نہ
معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے ان کی کوئی حق تلفی ہوگی۔

اوقات کار کی تحدید

اجرت کی تعیین کی طرح اوقات کار کی تحدید کا تعلق بھی اجیر و مستاجر کی رضامندی
اور معاہدہ سے ہے، اس بارے میں اسلام کوئی جبری طریقہ اختیار نہیں کرتا، بلکہ مستاجر کے
اخلاق اور جذبۂ ہمدردی کو ابھارتا ہے، اور اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اجیر کو اپنا بھائی
اور اپنے جیسا انسان سمجھے، اور ان سے ان کی قوت اور صلاحیت سے زیادہ کام نہ لے، لیکن
اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مستاجر سے اس بارے میں محض اپیل کر کے اجیر کو اس کے رحم و کرم پر
چھوڑ دیتا ہے، اور قانونی کارروائی نہیں کرتا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ خارجی اور قانونی دباؤ
سے پہلے انسان کے ضمیر اور قلب کے ذریعہ سے کام کرانا چاہتا ہے، جب اس داخلی قوت سے
کام نہیں چلتا تب خارجی دباؤ ڈالتا اور قانون کا استعمال کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

ولا تکلفوھم من العمل ما یغلبھم — ان سے ایسا کام نہ لو جو ان کو بالکل چور کر دے،

فان کلفتموھم فاعینوھم — اگر ان سے کوئی سخت کام لینا ہی ہو تو خود بھی ان کی اعانت کرو،

حضرت عمرؓ نے ارکانِ حکومت کو جو عام ہدایتیں دی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ان پر انکی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو، جب وہ تھک جائیں تو رک جاؤ۔[۱]

صحابہ کرامؓ اپنے ملازموں بلکہ اپنے جانوروں سے بھی سخت کام نہیں لیتے تھے، ایک شخص حضرت سلمان فارسیؓ کے پاس آیا، دیکھا کہ بیٹھے ہوئے آٹا گوندھ رہے ہیں، اس نے کہا کہ ملازم کہاں ہے، بولے ہم نے اس کو ایک کام کے لیے بھیجا ہے، اس لیے میں نے یہ پسند نہ کیا کہ اس سے دو دو کام لوں (طبقات ابن سعد) حضرت عثمانؓ رات کو اٹھکر خود وضو وغیرہ کا پانی لے لیا کرتے تھے، کسی نے کہا کہ آپ یہ کام کسی خادم سے لے لیا کرتے، بولے "رات ان کے آرام کے لیے ہے۔" (ایضاً تذکرہ حضرت عثمانؓ)

مختصر یہ کہ اسلام نے اوقات کار کی کوئی خاص تحدید نہیں کی ہے، بلکہ اس کو اجیر و مستاجر کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے، مگر یہ شرط لگا دی ہے کہ ان سے بہرحال اتنا کام نہ لیا جائے جو ان کی طاقت سے باہر ہو، یا یہ کہ انکی صحت پر اس کا برا اثر ڈالے، اسی اصول کے تحت اگر حکومت یہ دیکھے گی کہ اس سلسلہ میں مزدوروں پر کسی طرح کی زیادتی ہو رہی ہے، تو وہ وقت کی تحدید کا قانون بنا دینے کی مجاز ہوگی،

تعطیل ان کی آسایش و آرام کے سلسلہ میں ایک سوال ان کی چھٹی کا بھی آتا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی قانون اجرت میں اس کی گنجایش ہے کہ ہفتہ میں ایک دن اور سال کے ان دنوں میں انکو چھٹی دیجائے جو کسی مسلمان یا غیر مسلم اجیر کے لیے مقدس سمجھے جاتے ہیں، مثلاً مسلمانوں میں جمعہ کا دن زیادہ مقدس سمجھا جاتا ہے، عیسائیوں میں اتوار کا اور یہودیوں میں سنیچر کا، ہندوؤں کے یہاں منگل وغیرہ، اس لیے اگر مختلف عقیدوں کے اجیر چاہیں کہ ان کو اس دن چھٹی دی جائے تو ان کا یہ

۱؎ کتاب الخراج ص ۱۱۰، یہ حکم انھوں نے جنگ کے موقع پر دیا تھا، اس سے ظاہر ہو کر جنگ ایک ہنگامی ضرورت ہے جسمیں غیر معمولی طور پر کام کرنا ضروری ہوتا ہے، اسوقت اس کا لحاظ کیا گیا تو پھر دوسرے کاموں میں خاص طور سے اجیروں کیساتھ اسکا لحاظ ضروری ہوگا،

حق مستاجر اور حکومت کو ماننا پڑے گا، اس سلسلہ میں عاجز کو کوئی فقہی جزئیہ تو نہیں مل سکا، مگر جامع ازہر کے ایک عالم نے یہ لکھا ہے کہ اسلامی فقہ میں اس کی گنجایش ہے، انکی عبارت یہ ہے

ففی الفقه الاسلامی لو استاجر رجل یهودیا شهرا کاملا کانت السبت مستثناة من العمل (الحکمۃ تشریع الاد ص ۱۳۷)[۱] — اسلامی فقہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی یہودی کو ایک مہینہ کامل بطور مزدور کے رکھے تو سنیچر کا دن کام سے مستثنیٰ ہوگا، خواہ اس کا ذکر معاہدہ میں ہو یا نہ ہو،

ظاہر ہے کہ اس پر ہر اجیر کو خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم قیاس کرنا چاہیے کہ اس اخلاقی ذہنیت کی موجودگی، معاہدہ و اجرت کی آزادی اور قانون کی پشت پناہی کے بعد اس شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی کہ مستاجر مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان سے کام زیادہ لے سکتا ہے، یا کچھ کام بغیر اجرت بھی کرا سکتا ہے،

اجیروں کی توہین اور ان کو سزا مزدوروں اور عام اجیروں کی بے دلی اور بے چینی کا ایک خاص سبب ان کی توہین اور ان کی سزا بھی ہے، اور یورپ میں مزدوروں کے قوانین کی تشریح کے سلسلے میں انکی بھاری بھاری سزاؤں کا ذکر بھی آیا ہے، دوسرے ممالک میں بھی مزدوروں کو سخت سے سخت سزائیں دیجاتی ہیں، اس سلسلے میں جیل کی سزا کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، ہندوستان میں بھی اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اپریل ۵۵ء میں کانپور میں اسٹرائک ہوئی، اس میں ہزاروں مزدوروں کو جیل میں بند کر دیا گیا، مگر ایک مل مالک کو بھی سزا نہیں دی گئی،[۱] ۵ ستمبر ۵۵ء کو اڑیسہ میں بار بل کے مقام پر ایک سرکاری ینگنز کی کان کے مزدوروں پر پولیس نے ۱۸ راؤنڈ گولیاں چلائیں مگر کسی افسر کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی،[۲]

آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اجیروں اور مستاجروں کے جھگڑے میں ہمیشہ قصور اجیروں

۱؎ الجمعیۃ (مکتوب) ۲؎ قومی آواز ۱۶ ستمبر ۵۵ء

کا ہی ہوتا ہے، اجیر اگر اسٹرائک کر کے ملک کی صنعت کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو وہ مجرم قرار پاتے ہیں، لیکن اگر کارخانہ دار جو اپنی مفاد پرستی کے لیے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ مزدور ہڑتال پر مجبور ہوں، تو وہ مجرم نہیں، اسی طرح توہین کا مسئلہ بھی ہے، اس زمانہ میں گو کارخانوں کے مزدوروں کے ساتھ اس قسم کا معاملہ نہیں کیا جاتا، مگر ذاتی اور خانگی ملازموں اور چھوٹے کام کرنے والوں کے ساتھ عام طور پر توہین آمیز سلوک روا رکھا جاتا ہے، اور کارخانے اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے اجیروں کی سماجی قسم کی توہین ذہن میں موجود ہوتی ہے، چنانچہ موجودہ سوسائٹی میں کسی فرد یا جماعت کا محنت کش اور مزدور پیشہ ہونا ہی ان کو سماج میں گرا دیتا ہے، اور وہ سماج کے بہت سے اضافی اعزازات سے محروم ہو جاتے ہیں، عام رویہ یہی ہے، اگرچہ اس میں کچھ استثنائی مثالیں بھی دیجا سکتی ہیں،

توہین اور ذلت کو خواہ وہ کسی طبقہ کی ہو اور کسی طرح کی ہو، اسلام پسند نہیں کرتا، اور اس سے روکتا ہے، وہ مزدوروں کی معاشی مساوات پر اتنا زور نہیں دیتا، مگر معاشرتی، معاملاتی اور اخلاقی مساوات کی پوری تاکید کرتا ہے، چنانچہ وہ مزدوروں اور ملازموں کو خادم نہیں، بلکہ بھائی (اخوانکم) قرار دیتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی آقا اپنے غلام کو عبدی، میرا غلام نہ کہے، بلکہ فتائی میرا جوان کہے، اسی طرح غلاموں کو ممانعت ہے، کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب (پالنے والا) نہ کہیں، بلکہ مولی (کفیل) کہیں[1]،

اس طرح سزاؤں کے معاملہ میں اس نے اجیر و مستاجر کی حیثیت یکساں رکھی ہے، اور دونوں کو معاہد قرار دیا ہے، اس لیے جس کی طرف سے معاہدہ شکنی ہوگی، اس کو سزا دیجائیگی، مگر حکومت یہ ملحوظ رکھے گی کہ خود معاہدہ تو ایسا نہیں ہے، جس میں مزدوروں کی معاشی مجبوری

[1] بخاری ج ۲ ص باب ما ینہی عن السباب،

سے فائدہ اٹھا کر ان کی اجرت ہضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، چنانچہ اگر خود معاہدہ ہی میں اختلاف ہو جائے تو یہ دیکھا جائے گا کہ اختلاف کام کی نوعیت میں ہے یا اجرت میں، اگر کام کی نوعیت میں ہوگا تو مستاجر کی بات مانی جائے گی، اور اجیر کی زیادتی تصور کی جائے گی، اور اگر اجرت کے بارے میں اختلاف ہوگا تو اجیر کی بات مانی جائے گی اور مستاجر کی زیادتی سمجھی جائے گی، اس لیے کہ پہلی صورت میں استحقاق مستاجر کے ساتھ تھا، اور دوسری صورت میں اجیر کے ساتھ[1] اسی لحاظ سے جس کی زیادتی ہوگی وہ سزا پائے گا،

ہنگامی ضرورتوں میں مزدوروں کی کفالت

ان ضرورتوں کے علاوہ مزدوروں کی کچھ ہنگامی ضرورتیں بھی ہیں، جن کی تکمیل کے بغیر کوئی قانون اجرت مکمل نہیں کہا جا سکتا، مثلاً (۱) جسمانی نقصان کی تلافی (۲) از کار رفتہ ہونے کی صورت میں گذر اوقات کا سامان (۳) ہنگامی ضرورتوں کے لیے بلا سودی قرضے کا انتظام وغیرہ،

ان ضرورتوں اور حقوق کے سلسلے میں اسلام نے جو تدبیریں اختیار کی ہیں، وہ تین قسم کی ہیں، ایک جس کا تعلق پورے معاشرہ سے ہے، دوسری جس کا تعلق اجیروں سے ہے، اور تیسری جس کا تعلق حکومت سے ہے.

۱۔ سب سے پہلے اسلام معاشرہ کے عام افراد کے ذہن نشین کراتا ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی صاحب دولت و ثروت اور بے نیاز کیوں نہ ہو، زندگی میں کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑ ہی جاتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، اور دوسروں سے مدد لینی پڑتی ہے،

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے ہدایہ باب الاختلاف اور بدائع و صنائع ج ۵ باب اجارہ ص ۲۲۲، اس بارے میں کچھ ہلکا سا اختلاف ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد نے لکھا ہے کہ اس بارے میں عرف و عادت کا اعتبار کیا جائے، یعنی اسکا مقصد یہ ہے کہ اجیر عام طور پر کام میں بد دیانتی کرتا ہے، اسلیے اس بارے میں مستاجر کی بات مانی جائیگی، اور اجرت کے بارے میں مستاجر بد دیانتی کرتا ہے اس لیے اسکے بارے میں اجیر کی بات مانی جائے گی،

اس لیے معاشرہ کے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے مصیبت زدہ بھائی کی اعانت و دستگیری کرے، اپنی مطمئن حالت پر مغرور ہو کر اہل حاجت کی حاجت روائی سے بے پرواہ نہ ہوجائے، اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی دوسروں کی مدد کی ضرورت نہ پڑے گی، اس بارہ میں بہت سی آیات و احادیث ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، پھر بھی چند باتیں پیش کردی جاتی ہیں،

اہل ضرورت کی امداد کرنے کے سلسلہ میں قرآن نے پانچ لفظ استعمال کیے ہیں، سائل، محروم، غارم، مسکین، اور فقیر، عام طور پر ان الفاظ کے بہت محدود معنی مراد لیے جاتے ہیں، مثلاً سائل کے معنی "بھیک منگے"، محروم کے معنی "غنیمت یا دولت سے محروم" اور غارم کے معنی جس پر قرض کا بار ہو، اور فقیر و مسکین کے معنی غریب کے لیے جاتے ہیں، مگر محققین نے ان الفاظ کے معنی کو بہت زیادہ وسعت دی ہے، مثلاً

واما السائل فلا تنہر	سائل کو جھڑکو نہیں

میں سائل کی تشریح مجاہد نے یہ کی ہے کہ

واما من سألك من ذی حاجۃ	جو اہل حاجت تم سے کوئی مدد چاہے
فلا تنہر	تم اس کو جھڑکو نہیں۔

حسن بصری کا قول ہے کہ سائل سے مراد طالب علم ہے،

راغب نے تو سوال کے لفظ کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس میں انسان کی ہر ضرورت اور حاجت کو داخل کردیا ہے، (مفردات القرآن)

اسی طرح محروم کے لفظ کی تشریح میں صاحب لسان العرب لکھتے ہیں،

۱- من لا ینمی له المال	وہ شخص جو محنت کرتا ہو مگر اسکی آمدنی میں اضافہ نہ ہوتا ہو،
۲- المحارف الذی لا یکاد یکتب[1]	وہ مجبور محنت کش جو اپنی ضروریات پوری نہ کرپاتا ہو، یا پوری کرنے کے قابل نہ ہو،

اسی طرح امام راغب لکھتے ہیں:

المحروم ای لم یوسع علیه الرزق	محروم وہ شخص ہے جس کی روزی میں وسعت نہ ہو،

اسی وجہ سے کتے کو بھی محروم کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس کو لوگ عموماً روزی سے محروم رکھتے ہیں

تفسیر ابن جریر میں بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ مجاہد وغیرہ سے محروم کے لفظ کی تشریح محارف کے لفظ سے منقول ہے یعنی محروم سے مراد وہ شخص ہے جو روزی کمانے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ تنگ دست ہے،[2]

غارم کے لفظ کی تفسیر کے سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول اوپر گذر چکا ہے[3] امجاہد اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

من احترق بیته او یصیبه السیل فیذهب متاعه ویدان علی عیاله[4]	جس کا مکان جل گیا ہو، یا اس کو سیلاب سے نقصان پہنچا ہو، اور اس کو بال بچوں کی پرورش کے لیے قرض لینے کی ضرورت ہو،

فقیر و مسکین کی تفسیر عموماً یہ کی جاتی ہے کہ فقیر وہ شخص ہے جو تنگ دست ہو مگر اپنی ضرورت کا کسی سے اظہار نہ کرتا ہو، اور مسکین جو اپنی ضرورت کا اظہار کردیتا ہو،[5]

حضرت عمرؓ نے ان الفاظ کو اور وسعت دی ہے، انھوں نے فرمایا کہ وہ شخص جو کماتا ہو مگر

---

[1] لفظ حرم [2] سورۂ معارج تفسیر و فی اموالہم حق معلوم للسائل والمحروم [3] اگر بنیادی ضرورتوں کا سامان اس کے پاس موجود نہ ہو، مثلاً مکان، غلہ، جائداد، پھر بھی اگر وہ قرض دار ہوجائے یا قرض مانگے تو اس کو حکومت کی طرف سے دیا جائے گا [4] تفسیر طبری سورہ توبہ آیت انما الصدقات [5] ایضاً

اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں، اور پھٹے حال رہتا ہو، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے ایک فرمان میں لکھا تھا کہ

مسکین دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ لوگ جو کسی افتاد یا مجبوری کی بنا پر اپنی ضرورت پوری نہ کر سکتے ہوں، مگر کسی سے کچھ کہتے نہ ہوں، دوسرے وہ لوگ جو اپنی مجبوری اور ضرورت کا اظہار کرتے ہوں،

ان دونوں قسم کے لوگوں کو زکوٰۃ فنڈ سے مدد دینی چاہیے، [1]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کو اور بھی وسعت دی ہے، وہ فرماتے ہیں

۱- الفقراء الزمنی الذی لا حرفة لهم	ضرورتمند دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو سرے سے بے روزگار ہوں،
۲- واهل الحرف الذی لا تقع حرفتهم من حاجتهم موقعا	دوسرے وہ لوگ جن کا ذریعۂ معاش تو ہو لیکن معقول نہیں ہو کہ جس سے انکی ضروریات پوری ہو سکیں،
والمساکین السئوال من له حرفة تقع موقعا ولا تغنیه وعیاله [2]	اور مساکین وہ لوگ ہیں جن کے پاس ذریعہ معاش تو ہو مگر اس سے ان کے اہل وعیال کی کفالت نہیں ہو پاتی، اسلیے وہ مدد کے خواستگار ہوتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کے بعض اور الفاظ مثلاً بائس ۔ قانع اور معتر وغیرہ کی تفسیر سے بھی اس سلسلہ میں کافی رہنمائی ہوتی ہے.

اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی کثرت سے ملتے ہیں، چند ملاحظہ ہوں،

من کان فی حاجة اخیه	جو اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کریگا

[1] کتاب الاموال ص ۵۵۵، [2] تاج العروس لفظ فقیر

کان اللہ فی حاجته [1]	تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا.

آپ نے ارشاد فرمایا کہ بیواؤں، غریبوں اور اہل حاجت کی دیکھ بھال کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے. [2]

ایک بار فرمایا کہ خدا کی مخلوق اللہ کی عیال ہے، خدا کے یہاں سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے، [3]

خود حضورؐ کا اسوہ یہ تھا کہ جب کوئی سائل یا حاجت مند آجاتا تو آپ فرماتے کہ تم میرے پاس ان کی سفارش کر دیا کرو تم کو اجر ملے گا. [4] مقصد یہ تھا کہ ممکن ہے کہ وہ آنے میں جھجھک محسوس کرے یا اپنی ضرورت نہ بیان کر سکے، اسلیے تم اس کی ضرورت کہہ دیا کرو، آپ نے یہ عام اعلان کر دیا تھا کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو، میں اسکا وارث ہوں، جس کا کوئی کفیل نہ ہو، میں اس کا کفیل ہوں،

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱- معاشرہ کے ہر فرد کا یہ ایک اخلاقی فرض ہے کہ وہ حاجت مندوں، غریبوں، اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرے،

۲- حاجت مند اور اہل ضرورت محض وہی لوگ نہیں ہیں جو بالکل بے وسیلہ اور بے سہارا ہوں، بلکہ وہ لوگ بھی ہیں جو ذریعۂ معاش رکھتے ہوئے بھی اہل وعیال کی کثرت اور اخراجات کی زیادتی [5] کی وجہ سے پریشان حال ہوں، جیسا کہ عام طور پر متوسط طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔

۳- اگر کوئی شخص کسی ضرورت مند کی خود مدد نہ کر سکے تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اہل ثروت

[1] مشکوٰۃ باب الرحمۃ علی الخلق [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ان اخراجات کی زیادتی کے ساتھ علماء نے یہ شرط لگا رکھی ہو کہ لا اسراف ولا تبذیر ولا فساد، یعنی فضول خرچی، تعیش اور معاشرہ میں کوئی فساد پیدا کرنے میں اخراجات نہ ہوئے ہوں،

سے یا حکومت سے اس کی مدد کرانے کی کوشش کرے۔

ممکن ہے کہ اس سے کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ اس تعلیم سے گداگری کو شہ ملے گی، اور لوگوں میں محنت کے بجائے دوسروں کے سہارے جینے کی ذہنیت پیدا ہوگی، اور یہ دونوں چیزیں انسان کی سیرت و کردار کے لیے مضر ہیں، مگر اوپر جو باتیں محنت کے سلسلے میں کہی گئی ہیں، اور وہ ذہن میں رکھی جائیں، تو یہ شبہ جاتا رہے گا، اس کی مزید تفصیل یہاں پیش کی جاتی ہے۔

اسلام نے سوال کرنے اور مدد مانگنے کی اجازت ضرور دی ہے، مگر مجبوری کی حالت میں، ورنہ گداگری اور کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور دوسروں کے سہارے پر جینے کو سخت ناپسند کیا ہے، اور اس کو دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی قرار دیا ہے، چنانچہ قرآن مجید نے ان لوگوں کی توصیف کی ہے جو ضرورت مند ہوتے ہیں، مگر باوجود مفلسی اور ناداری کے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں حیا محسوس کرتے ہیں، اور اگر ضرورت پیش آجاتی ہے تو اس قدر "تعفف" یعنی شرم و حیا کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ ان کی حاجت یا ضرورت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے اور ناواقف لوگ تو ان کو مالدار سمجھتے ہیں،

یحسبھم الجاھل اغنیاء من	ناواقف لوگ، ان کی خودداری اور عدم سوال
التعفف تعرفھم بسیماھم	کے باعث ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم صرف
لایسئلون الناس الحافا	ان کے چہرے بشرے سے ان کی ضرورت کو
(بقرہ)	جان سکتے ہو، وہ گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار چند صحابہ سے بیعت لی، جن باتوں پر بیعت لی ان میں ایک یہ بھی تھی کہ

لاتسئلوا الناس شیئاً[1]	لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگنا،

[1] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب کراہیۃ المسئلہ،

ایک بار فرمایا، جو شخص گداگری کو پیشہ بنالیتا ہے، وہ قیامت کے دن اس حالت میں آئیگا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا،[2]

آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم تم میں کسی کا رسی لیکر لکڑی کاٹ کر اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے۔[3]

اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابۂ کرامؓ ابتدائی زمانہ میں اپنی انتہائی تنگ دستی اور ضرورت کے باوجود کسی سے سوال نہیں کرتے تھے، بعض لوگ یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ اگر وہ اونٹنی پر سوار ہوتے اور ان کا کوڑا گر جاتا تو خود اتر کر کوڑا اٹھا لیتے، کسی دوسرے سے اٹھانے کیلیے نہ کہتے تھے، ان ہی لوگوں میں حضرت صدیقؓ بھی تھے،[4] حالانکہ اس طرح کے سوال سے انکو منع نہیں کیا گیا تھا،

ایک صحابی حکیم بن حزامؓ نے ایک بار آپ سے مانگا، آپ نے مرحمت فرمایا، انھوں نے پھر مانگا، پھر آپ نے دیا، تیسری مرتبہ سوال پر بھی آپ نے عنایت فرمایا، اور یہ نصیحت کی کہ اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ ہے، مگر جو شخص اس کو کشادہ دلی اور شرافت نفس کے ساتھ لے گا تو اس میں برکت ہوگی، اور جو لالچ کے ساتھ لیگا، اس کو برکت نہ ہوگی، اور اس کی حالت اس شخص کی سی ہوگی جو کھاتا چلا جائے، مگر اس کا پیٹ نہ بھرے"، اس نصیحت کے بعد ان کا یہ حال ہو گیا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ان کو ان کا وظیفہ دینے کے لیے بلایا جاتا مگر وہ انکار کرتے تھے۔[5]

ایک صحابی مالک بن سنانؓ کا حال یہ تھا کہ ایک بار وہ تین دن تک بھوکے رہے، مگر کسی سے کچھ مانگا نہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ جس کو عفیف المسئلہ شخص کو دیکھنا منظور ہو تو وہ مالک بن سنان کو دیکھ لے،[6]

[2] بخاری کتاب الزکوۃ باب من سال الناس تکثرا [3] ایضاً [4] مسند ج ۱ ص ۱۱ باب کراہتہ المسئلہ [5] بخاری باب الاستعفاف [6] اسد الغابہ تذکرہ مالک بن سنان

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اگر میں کسی نوجوان کو دیکھتا ہوں کہ وہ بیکار ہے تو میری نظر سے گر جاتا ہے،

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے کس طرح گداگری کو مٹانے کی کوشش کی ہے، اور اس کو اس میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے، مگر چونکہ انسانی ضروریات کے لیے ناگزیر ہے، اس لیے اس نے شدید ضرورت کی حالت میں سوال اور امداد کی اجازت دی ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کا اہتمام بھی کیا ہے کہ حاجتمندوں اور ضرورت مندوں میں ذلت وخواری، دنائت وپستی نہ پیدا ہونے پائے اور خودداری اور شرافتِ نفس برقرار رہے، اسی لیے مدد دینے والوں کو یہ تاکید ہے کہ وہ یہ سمجھکر نہ دیں کہ وہ سائل پر احسان کر رہے ہیں، بلکہ یہ تو سائل کا احسان ہے کہ اس کی وجہ سے دینے والا خدا کے یہاں اجر کا مستحق ہو گیا، اس سلسلہ میں جو کچھ وہ خرچ کرے گا وہ خدا کی راہ میں ہوگا، اس لیے گویا اس نے اپنا ایک فرض ادا کیا، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار تاکید کی ہے

ولا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی	اپنے صدقات کو احسان دکھکر اور تکلیف پہنچا کر برباد نہ کرو،
قول معروف خیر من صدقۃٍ یتبعھا اذی	اچھی بات اس صدقہ سے زیادہ بہتر ہے جس میں کوئی تکلیف شامل ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مالی یا جانی امداد کیجائے اس میں نام ونمود کا جذبہ نہ ہو، بلکہ زیادہ سے زیادہ اخفا اور پوشیدگی ہو، یہاں تک کہ داہنا ہاتھ دے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو،

اسی طرح کھانا، کپڑا یا مال واسباب میں سے جو چیز بھی کسی کو بطور مدد دیجائے وہ خراب خستہ سڑی گلی یا بیکار نہ ہو، بلکہ من کرائم الاموال یعنی وہ بہتر سے بہتر ہو،

ظاہر ہے کہ ان تدبیروں کے بعد یہ شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام گداگری اور دوسروں کے سہارے جینے کی ادر ذلیل ذہنیت پیدا کرتا ہے،

(باقی)

دلّی اور لکھنؤ کی شاعری

اور

ایک کا دوسرے پر اثر

از جناب مولانا عبدالسّلام صاحب ندوی

(۴)

ہماری اردو شاعری کی یہ تاریخی خصوصیت بھی نہایت عجیب ہے کہ اس کے ہر دور میں ایک شاعر کو دوسرے شاعر کا مدمقابل قرار دیا گیا ہے، سوداؔ میرؔ کے، انشاؔ مصحفیؔ کے، ناسخؔ آتشؔ کے، ذوقؔ غالبؔ کے، امیرؔ داغؔ کے، اور دبیرؔ انیسؔ کے مدمقابل ہیں، اور ہمارے تنقید نگاروں نے بڑی دیدہ ریزی سے ان کا موازنہ کیا ہے، لیکن ان میں سوداؔ کا مقابلہ میرؔ سے ایک حد تک تو صحیح ہے، لیکن کوئی صاحبِ فن انشاؔ کو مصحفیؔ کا، ناسخؔ کو آتشؔ کا، ذوقؔ کو غالبؔ کا، امیرؔ کو داغؔ کا اور دبیرؔ کو انیسؔ کا حریف نہیں قرار دے سکتا، لیکن اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ اس آخری دور میں اس معاملہ میں دوہری غلطی کی گئی، ایک تو یہ کہ امیرؔ کو داغؔ کا حریف قرار دیدیا گیا، دوسرے یہ کہ جلالؔ کو جو داغؔ کا کامیاب مقابلہ کر سکتے تھے، مقابلے کے میدان سے بالکل پیچھے ہٹا لیا گیا، تاہم بہر حال صاحب کمال اپنے کمال پر بلا مقابلہ بھی فخر کر سکتا ہے، اور جلالؔ کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ وہ لکھنوی شاعری کے آخری مجدد ومصلح ہیں، لیکن اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ امیرؔ کو داغؔ وجلالؔ کے

مقابلے میں بالکل پست کردوں، وہ ایک مضمون آفریں اور نازک خیال شاعر ہیں، اور ناسخ اور تلامذۂ ناسخ نے جس قسم کی نازک خیالی کا سنگ بنیاد رکھا تھا، اس پر انھوں نے بھی بہت سے ردے چڑھائے ہیں، اور ان کے پہلے دیوان مراۃ الغیب میں اس نازک خیالی کے نمونے بکثرت ملتے ہیں،

مولانا عبدالحئی صاحب مرحوم تذکرہ گل رعنا میں لکھتے ہیں کہ " امیر و داغ اس دور میں فلک شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے، ایک مضمون آفرینی کا دلدادہ تھا، دوسرا بیان کی شوخی اور معاملہ نگاری پر فریفتہ، امیر کے یہاں نازک خیالی کے ساتھ شکوہ الفاظ کی بھی چاشنی ملی ہوئی تھی، اور مزا یہ ہے کہ اس میں دقت پسندی کو وہ جائز نہیں رکھتے تھے، مگر افسوس ہے کہ باوجود صحت زبان و پختگی کلام کے تاثیر یا سوز و گداز کا کہیں پتہ نہیں، اصل یہ ہے کہ انداز بیان کا جو سانچہ ناسخ و آتش کے زمانہ میں تیار ہوا تھا اس میں ڈھل کر شعر بامزہ ہو ہی نہیں سکتا"

لیکن ریاست رام پور میں داغ کے رنگ کلام کی شوخی کو دیکھکر خود امیر کو محسوس ہوا کہ اب ان کا پھیکا پھیکا کلام دو دہن کے لیے لذت بخش نہیں ہو سکتا، اس لیے انھوں نے قدیم رنگ کو چھوڑکر داغ کا انداز بیان اختیار کیا، پہلا دیوان یعنی مراۃ الغیب بالکل ناسخ اور تلامذۂ ناسخ کے رنگ میں تھا، دوسرے دیوان یعنی صنم خانۂ عشق میں بھی اگرچہ کسی قدر قدیم رنگ کا کلام شامل ہے، لیکن اس کا رنگ بھی مراۃ الغیب سے مختلف ہے، ان کے علاوہ جدید رنگ یعنی داغ کے رنگ کی غزلیں ہیں، اور ان دونوں رنگوں کی آمیزش سے اس دیوان میں دورنگی پیدا ہو گئی ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں،

دیوان میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں — پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک امیر

اگرچہ رنگ بدلنے کے بعد بھی وہ داغ و جلال کے درجہ کو نہ پہونچ سکے، تاہم قدیم رنگ کے بہت سے داغ دھبے مٹ گئے، رعایت لفظی کا ذوق جاتا رہا، ابتذال رخصت ہو گیا،

پھبتی نما تشبیہیں باقی نہ رہیں، خارجی مضامین یعنی معشوق کے اعضاء اور سامان آرایش کے بجائے جذبات و واردات سے ان کا کلام آشنا ہوا، اور اس کا اثر یہ ہوا کہ

(۱) تشبیہات میں لطافت پیدا ہو گئی، مثلاً

وہ ہم نازک دلوں کو آنکھ دکھلائے تو کیا گذرے — دوکانِ شیشہ گر میں مست آجائے تو کیا گذرے

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی — کاروانِ عمر گذرا آگ باقی رہ گئی

(۲) کلام میں محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی شامل ہو گئی، مثلاً

نامہ بر یار کے آنے کی نہیں کہتا ہو — ایک بھی بات ٹھکانے کی نہیں کہتا ہو

تو کھینچے گا اُس کی شکل مانی — تو نے کہی اور میں نے مانی

لیا ہے غیر نے بوسہ اسی کو گالی دو — خفا ہو مجھ سے نہ لینے میں میں نہ دینے میں

نکلے اب کوئی تو راہ پرورش — بندہ پرور اک نگاہ پرورش

(۳) میر تقی میر، خواجہ میر درد اور خواجہ آتش کے رنگ میں بعض غزلیں اور بعض اشعار انھوں نے ایسے لکھ دیے ہیں جن میں تاثیر اور سوز و گداز سب کچھ ہے، مثلاً

عالم شگفتہ ہو جو میں آفت رسیدہ چھو — صبح بہار ہوں جو گریباں دریدہ ہو

راغب مری طرف ہو کوئی دل نہ کوئی گو — بزم جہاں میں حرف مکرر شنیدہ ہو

اے اہل بزم مجھکو اٹھاؤ نہ بزم سے — شمعِ سحر ہوں عمر بپایاں رسیدہ ہو

مجروح تیغ حسن ہوا کب خبر نہیں — یوسف کی جلوہ گاہ میں دست بریدہ ہو

ابتک کسی پہ میری حقیقت نہیں کھلی — حرفِ نگفتہ ہوں سخنِ ناشنیدہ ہو

مطلب خزاں سے کچھ نہ غرض ہے بہار سے — دونوں سے مثل سرو میں دامن کشیدہ ہو

بلبل ہوں میں نہ گل ہوں گلستان دہر میں — ہاں اک پر شکستہ و رنگ پریدہ ہوں

شبنم کے لئے امیرؔ ملے ہیں مجھے نصیب — گل ہنس پڑیں چمن میں جو ہیں آبدیدہ ہوں

ہم کو وزیر سے نہ کسی شاہ سے غرض — اللہ کے فقیر ہیں اللہ سے غرض

یہ بوجھ ان کے سر پہ رہے جو ہیں اغنیا — کیا مجھ گدا کو خیمۂ و خرگاہ سے غرض

تکلیف ہے پر شکر گدا کو ہے مناسب — شاہوں کی طرح کچھ غم عالم تو نہیں ہے

اس انقلاب کے باوجود بھی اگرچہ وہ خود داغؔ کے درجہ کو نہ پہنچ سکے، تاہم اس میں جو کمی رہ گئی تھی اس کو جلالؔ نے پورا کر دیا، اس لیے اس دور میں غزل کی ترقی میں مجموعی طور پر لکھنؤ نے دلی کے برابر برابر حصہ لیا، لیکن اور انواعِ شاعری میں دلی پر لکھنؤ کا تفوق اس دور میں بھی قائم رہا، مثلاً قصائد میں امیرؔ کا درجہ داغؔ سے بلند تسلیم کیا جاتا ہے، امیرؔ نے واسوخت بھی کثرت سے کہے ہیں، جن کا مجموعہ مینائے سخن کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور اخیر دور میں صرف وہی ایک ایسے شاعر ہیں جن نے قدما اور متوسطین کے دور کی اس یادگار کو قائم رکھا ہے، امیرؔ نے نعت گوئی میں بھی خاص ناموری حاصل کی ہے، اور ایک پورا نعتیہ دیوان مرتب کیا ہے، جس میں قصائد، غزلیات، رباعیات، ترجیع بند، مخمس، سلام اور مناجات سب شامل ہیں، اس دیوان کے علاوہ متعدد مثنویاں اور متعدد نظمیں مثلاً صبح ازل، لیلۃ القدر، نور تجلی، شام ابد، اور ابر کرم وغیرہ لکھی ہیں، جس میں مذہبی حکایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات وغیرہ نظم کیے ہیں، شعرائے لکھنؤ میں اس دور میں محسنؔ کاکوروی نے بھی نعت گوئی کو جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں،

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسنؔ — کلام نعتیہ رکھا مری زباں کے لیے

اپنا خاص فن بنا لیا اور اس موضوع پر بہت سے قصائد اور مثنویاں لکھیں،

مثنوی کی ترقی میں بھی شعرائے لکھنؤ نے نمایاں حصہ لیا اور منشی امیر اللہ تسلیمؔ اور ان کے شاگرد

شوقؔ نیموی نے عمدہ عمدہ مثنویاں لکھیں، اس میں دلی کا کوئی شاعر ان کا شریک نہیں، مرثیہ گوئی نے لکھنؤ ہی میں نشو و نما حاصل کی تھی اور یہ صنف شاعری لکھنؤ ہی میں محدود ہو کر رہ گئی، شعرائے دلی میں کسی نے مرثیہ نہیں لکھا، ان وجوہ سے مجموعی طور پر اس دور میں بھی لکھنؤ کی شاعری کا پلہ دلی کی شاعری سے بھاری رہا، شاعری کے علاوہ نفس اردو زبان کی جو خدمت اساتذۂ لکھنؤ نے اس دور میں کی ہے، اساتذۂ دہلی میں اس حیثیت سے کوئی شخص ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، حکیم سید ضامن علی جلالؔ نے سرمایۂ زبان اردو کے نام سے ایک لغت لکھا ہے جس میں اردو کے محاورے اور اصطلاحیں جمع کی ہیں، تذکیر و تانیث کی بحث میں ان کا ایک مستقل رسالہ مفید الشعراء ہے، قواعد المنتخب ایک اور رسالہ ہے جس میں بعض مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق کی ہے، اور اکثر ہندی الفاظ کی اصل بتائی ہے، تنقیح اللغات اور گلشن فیض بھی زبان اردو کے دو لغت انھوں نے مدون کیے ہیں، دستور الفصحا نامی ایک رسالے میں اس دور کے متروک الفاظ جمع کیے ہیں، لیکن یہ رسالہ ان کے صاحبزادہ حکیم محمد مہدی کمالؔ کے نام سے شائع ہوا ہے،

ان کتابوں کی فہرست درج کرنے کے بعد رام بابو سکسینہ صاحب نے ان کی لسانی خدمات پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے، "فہرست مذکورۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تحقیق زبان کے ساتھ بڑا شغف تھا، اور مثل اپنے استاد رشکؔ کے انھوں نے بھی اکثر رسالے اور لغات زبان اردو کے الفاظ و محاورات و اصطلاحات کے متعلق تصنیف کیے، بلکہ کہا جاتا ہے کہ جس کام کو رشکؔ نے شروع کیا تھا اس کو انھوں نے درجۂ تکمیل کو پہنچا دیا، ہر چند کہ ان کی یہ تصانیف ایک ابتدائی صورت میں ہیں اور ان کے بعد اب بڑی بڑی کتابیں اسی موضوع میں نہایت شرح و بسط اور زیادہ تفصیل و تنقید کے ساتھ لکھی گئی ہیں، مگر پھر بھی جلالؔ کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے،

اس دور میں اردو کا سب سے مکمل اور سب سے مستند لغت امیر مینائی نے امیر اللغات کے نام سے لکھنا چاہا تھا،

جو افسوس ہے کہ پورا نہ ہو سکا، اس کی صرف دو جلدیں الف ممدودہ و الف مقصورہ کی شائع ہوئی ہیں، اگر یہ کتاب پوری ہو گئی ہوتی تو اردو زبان کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہوتا۔

انھوں نے ایک اور رسالہ سرمۂ بصیرت کے نام سے لکھا ہے، جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو اردو میں غلط طور پر استعمال ہوتے ہیں، اور اس میں ان کا صحیح طریقہ استعمال معہ اسناد کے بتایا ہے، اردو محاورات و الفاظ کا ایک اور لغت بہار ہند کے نام سے لکھا ہے جو نور اللغات کا نقش اول ہے، انھوں نے شعرائے رام پور کا ایک تذکرہ بھی لکھا ہے، مولوی نور الحسن نیر نے نور اللغات کی تالیف میں جو سرگرمی ظاہر کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں،

یہ تو اس دور کے اساتذہ کا حال تھا، اس کے بعد ان کے تلامذہ کا حال یہ ہے کہ جس طرح آتش کے تلامذہ نے آتش کے رنگ کو اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا، بعینہ اسی طرح اس دور میں امیر کے تلامذہ نے ان کے جدید رنگ کو جس کو انھوں نے داغ کی تقلید میں اختیار کیا تھا، اور بھی زیادہ شوخ کر دیا اور بعض وجوہ سے اس رنگ میں اپنے استاد سے زیادہ تفوق و امتیاز حاصل کیا، مثلاً امیر کا کلام مجموعی طور پر مخلوط رنگ میں ہے، یعنی پہلا دیوان بالکل تلامذہ ناسخ کے رنگ میں کہا گیا ہے، اور دوسرے دیوان میں بھی لکھنؤ کے قدیم رنگ کی بہت کچھ آمیزش ہے، اس دیوان میں ان کے کلام کا صرف ایک حصہ ہے، جو داغ کے رنگ میں کہا گیا ہے، جلال کا بھی یہی حال ہے کہ ان کے پہلے دیوان میں لکھنؤ کا کلام کافی حد تک موجود ہے، اس کے بعد انھوں نے بتدریج زبان میں صفائی اور لوچ لچک پیدا کی ہے، اور اس لوچ لچک کا اظہار زیادہ تر تیسرے بلکہ اس سے زیادہ چوتھے دیوان سے ہوتا ہے، ان کے تلامذہ نے اسی آخری حصۂ کلام کی تقلید کی ہے، اس لیے وہ لکھنؤ کی قدیم روش سے محفوظ رہ گئے ہیں، اور ان کے کلام میں جو کچھ ہے ہنر ہی ہنر ہے، عیب نہیں ہے، اگرچہ امیر کے تلامذہ میں حافظ جلیل حسن جلیل نے امیر کے تتبع و تقلید میں زیادہ ناموری حاصل کی ہے، جیسا کہ

ان کے خواجہ تاش بھائی حفیظ جونپوری فرماتے ہیں

اے امیر آپ اور تقلید امیر — یہ جلیل نامور کا کام ہے

اس لیے امیر کے کلام کی خصوصیات ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں، تاہم جب قدر زمانہ گذرتا گیا اور ان کی زبان منجھتی گئی، ان کا کلام بھی اس قسم کے داغ دھبوں سے پاک ہوتا گیا، اور عمدہ کلام کی جو خصوصیات ہیں، وہ ان کے کلام میں پیدا ہوتی گئیں، یعنی یہ کہ

(۱) ان کے کلام میں سلاست اور روانی پیدا ہو گئی، اور بعض موقعوں پر وہ بالکل داغ کی بولی بولنے لگے، مثلاً

کیا بات ہے گر بوسۂ لب کرکے عنایت — تم مجھ سے کہو بس ہیں کہو تم سے نہیں اور

ایما ہے کہ کوٹھا ہی کریں خاک یہ عاشق — منشا ہے کہ ہموار ہو کوچے کی زمیں اور

بہت رہ چکے حضرت غم یہاں — کرم کرتے اور کوئی گھر دیکھتے

فقروں کا توازن بھی جس کی مثالیں داغ کے یہاں بکثرت ملتی ہیں ان کے کلام میں جابجا موجود ہے، مثلاً

حسیں ہیں ان کو ہر صورت سے دل قابو میں کر لینا — بگڑ کر، مسکرا کر، گرم ہو کر، مہرباں ہو کر

کھنچتا بھی ہے، رکتا بھی ہے، تنتا بھی ہے لیکن — قاتل کی ادا خنجر قاتل میں نہیں ہے

داغ کا تیور اور تیکھا پن بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے، مثلاً

کیا تماشا ہو جو کرتے ہیں وہ وعدہ وصل کا — دل یہ کہہ دیتا ہے چپکے سے، ارے جب یاد بھی

اسی سلسلے میں انھوں نے محاورہ بندی کی طرف بھی توجہ کی ہے، مثلاً

انکار کا گماں ہے نہ اقرار کا یقیں — یہ بات ختم ہو گئی ان کی زبان پر

جان بھی نذر بت خودکام ہے — اب یہاں کیا ہے خدا کا نام ہے

(۲) رندانہ مضامین میں نہایت سرمستی پیدا ہو گئی، مثلاً

ترا شباب رہے ہم رہیں شراب رہے
یہ دور عیش کا تا دور آفتاب رہے

وہ ہائے مجمعِ رنداں وہ میکدے کی بہار
وہ مے چھلکتی ہوئی خوشنما پیالوں میں

(۳) سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں داخلی رنگ کی آمیزش ہو گئی، اور ان کے دیوان کے ہر صفحہ میں جذبات و واردات کی جھلک نظر آنے لگی، مثلاً

کہدو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال
مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے،

آپ کے دم سے یہ شیرازہ بندھا ہے ورنہ
میں کہیں ہوش کہیں اور کہیں دل ہوتا

میں اپنے ہوش میں اے فتنہ گر نہیں بھی
تری خبر تو ہے اپنی خبر نہیں نہ سہی

اے ہوائے چمنِ عشق مرے دل سے نہ جا
اے غبارِ راہِ جاناں مرے دامن کو نہ چھوڑ

سرزمینِ کوئے جاناں ہائے کیا دلچسپ ہے
بیقراری بیٹھنے دیتی تو دم بھر بیٹھتے

امیر کے تلامذہ میں حفیظ جونپوری صفائی اور برجستگی میں جلیل سے بھی سبقت لے گئے ہیں، اور داغ کی روانی، داغ کی شوخی اور داغ کے تیکھے پن سے اپنے کلام میں غیر معمولی رنگینی اور رعنائی پیدا کر دی ہے، مثلاً

مرا دل آگیا ہے اک حسیں پر
یہ سنتا تھا کہ وہ بولے ہمیں پر

یہ فقرے، یہ چالیں، یہ باتیں، یہ گھاتیں
تجھے او دغا باز ہم جانتے ہیں

یا تو بگڑے ہوئے تیور مرے پہچان گئے
یا وہ کچھ بات ہی ایسی تھی کہ جھٹ مان گئے

یہ تو آتے ہی جانے کی تم نے خوب کہی
ہنسے نہ تھے کہ رلانے کی تم نے خوب کہی

ترا جلوہ ہے ہر سو، رونقِ ہر دو جہاں ہے تو
ادھر ہے تو، اُدھر ہے تو، یہاں ہے تو، وہاں ہے تو

خیر مجھ میں وفا نہیں، نہ سہی
یہ تو فرمایئے کہ ہے کس میں

حسن میں تیرا کوئی ثانی نہیں
آگئی زاہد کی اس میں حور تک

اس انقلاب کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ بھی نکلا کہ قدماء اور متوسطین کے دور میں جو لوگ سادہ گو اور صفائی پسند تھے، حفیظ نے ان کی بھی تقلید کی اور داغ کے علاوہ اور اساتذہ کے رنگ میں بھی کہنے لگے، جیسا کہ خود کہتے ہیں،

شعر ہر رنگ میں کہتا ہے ترا کام حفیظ
آج ہم مان گئے، مان گئے، مان گئے

میر کی تقلید پر تو وہ خود فخر کرتے ہیں:

میر کے انداز پر کس نے غزل لکھی حفیظ
مجھکو زیبا ہے اگر اس بات کا دعویٰ کروں

اور ان کے بہت سے اشعار بھی اس دعویٰ کی تائید کرتے ہیں، مثلاً

بیٹھے بیٹھے راستہ قاصد کا دن بھر دیکھنا
تارے گننا شام سے یا جانبِ در دیکھنا

جس روز رکا نامہ و پیغام تمھارا
مر جائے گا لے لے کے کوئی نام تمھارا

لطف آئے جو پچھلے کو سنو کان لگا کر
رٹتا ہے عجب لے سے کوئی نام تمھارا

مٹنے کی آرزو ہے اسی رہگذار میں
اتنے لُٹے کہ لوگ کہیں خاکِ پائے دوست

حسرت ہے نزع میں ہو خطِ شوق آنکھ پر
بالیں ہو اور قاصدِ فرخندہ فال ہو

اور ان کے کلام سے جابجا خواجہ آتش کی فقیرانہ شان بھی نمایاں ہوتی ہے، مثلاً

حفیظ جاہ و حشم سے کسی کے کیا مطلب
فقیر مست ہوں اپنا ہے مجھکو حال پسند

اے قناعت تیری مٹھی میں ہے انکی آبرو
شرم سے بہرِ دعا جو ہاتھ اٹھا سکتے نہیں

جہادِ نفس کی سر ہو مہم تو کیا کہنا
زہے نصیب ملے مرتبہ جو غازی کا

توکل پہ اکثر گذارا رہا
فقیرانہ مشرب ہمارا رہا

عبادت ہوئی کچھ نہ طاعت ہوئی
فقط اب کرم کا سہارا رہا

غرض حفیظ جونپوری کا کلام گلہائے رنگا رنگ کا ایک گلدستہ ہے، اور امیر کے تلامذہ میں وہ اس حیثیت سے ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، لیکن امیر کے تلامذہ میں خالص داغ کے رنگ میں کہنے والے زیادہ تر حضرت ریاض خیرآبادی تسلیم کیے جاتے ہیں، مثلاً

غلط ہے آپ نہ تھے ہمکلام خلوت میں ۔ عدو سے آپ کی تصویر بولتی ہوگی

یہی کثرت ہے اسیروں کی تو میرا ذمہ ۔ ارے صیاد جو دو دن بھی ترا دام چلے

آہ کیا بے اثر ہی جائے گی ۔ کچھ نہ کچھ کام کر ہی جائے گی

میرے گھر میں اگر بلا آئی ۔ ڈر ہی جائے گی مر ہی جائے گی

نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آئینگے ۔ نہ کھا قسم ارے جھوٹے کبھی جو تو آئے

کہے کہے نہ کہے کوئی مجھکو کیا اس سے ۔ سنیں سنیں، نہ سنیں آپ داستاں میری

انھوں نے خمریات یعنی شراب وکباب کے مضامین میں بھی خاص طور پر ناموری حاصل کی ہے، اور دور جدید کے تعلیم یافتہ گروہ نے اسی شہرت اور خصوصیت کی بنا پر ان کو اردو زبان کا حافظ اور خیام قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان کے رندانہ کلام میں وہ جوش اور سرمستی نہیں پائی جاتی جو خیام اور حافظ بلکہ آتش اور تلامذہ آتش کے کلام میں پائی جاتی ہے، سب سے مقدم بات تو یہ ہے کہ شراب و کباب کے مضامین کو تغزل سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے، غزل کا موضوع عشق و محبت ہے، عیش و عشرت نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ خالص عاشقانہ رنگ میں غزل کہتے ہیں، انکے کلام میں اس قسم کے مضامین بہت کم پائے جاتے ہیں، مثلاً میر تقی میر، خواجہ میر درد اور حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی نے اس قسم کے مضامین بہت کم باندھے ہیں، البتہ ان مضامین کو غزل سے مناسبت ضرور ہے، کیونکہ عشق و محبت میں ہمیشہ مصیبت ہی مصیبت نہیں آتی بلکہ کبھی کبھی عیش و عشرت بھی نصیب ہو جاتا ہے، اور زندگی کے اس لمحے میں شراب عاشق کے

دل میں غیر معمولی جوش اور ولولہ پیدا کر دیتی ہے، اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے،

پہلو میں نگار ہاتھ میں جام ۔ اس وقت تو بادشاہ کیا ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ شراب وکباب کے مضامین میں جوش و سرمستی کا اظہار لازمی ہے، اسی کے ساتھ اگر اشعار میں روانی اور برجستگی، الفاظ میں شگفتگی اور رنگینی بھی پائی جائے، اور ساتھ ساتھ سبزہ و جوبار اور باغ و بہار کا ذکر بھی کیا جائے تو ان مضامین کی لطافت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، اگرچہ اس قسم کے برجستہ اور پرجوش رندانہ اشعار جابجا قدما کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً

چمن سب لہلہاتے ہیں، پڑے بادل برستے ہیں ۔ شتاب آ ساقیا ہم بادہ نوشی کو ترستے ہیں

دیر سے ہوں منتظر مے کا میں لے پیر مغاں ۔ دے بہ عشق ساقی کوثر کوئی ساغر شتاب

میکدہ میں دہر کے پھر دیکھ بدمستی مری ۔ پھینک ماروں آسماں پر لیکے جام آفتاب

شاہ حاتم نے اس بزم طرب میں معشوق کو مدعو کر کے اس مضمون کے جوش و اثر کو اور بھی بڑھا دیا ہے،

آؤ چمن میں گلرو دیکھیں بہار ہم تم ۔ اور بیٹھکر لب جو ہوں ہمکنار ہم تم

اس ابر، اس ہوا میں یوں آتا ہے دل میں ۔ پی پی شراب ہو دیں بے اختیار ہم تم

مجلس میں گو کہ شیشے خالی ہوئے تو ہو دیں ۔ اب میکدہ میں چلکر توڑیں خمار ہم تم

لیکن یہ شراب متوسطین کے دور میں زیادہ تند و تیز ہوئی ہے، اور آتش اور تلامذہ آتش اور مرزا غالب نے اس قسم کے مضامین کو نہایت جوش و طرب سے ادا کیا ہے، مثلاً

رندوں کی یہ دعا ہے ویسی بہار آئے ۔ صحرا میں قہقہے ہوں اور چہچہے چمن میں

رند ہوں لطف بہار زندگانی چاہیے ۔ ابر نوروزی شراب ارغوانی چاہیے

غالب کے کلام کی ایک خصوصیت جوشِ بیان ہے، اور وہ رندانہ مضامین میں حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے، مثلاً

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب | دے بطے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ ارباب چمن | سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو | موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
شرح ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل | رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب
ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد | پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

غالب کا یہ ایک شعر سیکڑوں رندانہ مضامین کے اشعار پر بھاری ہے،

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے | رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

لیکن جوش، سرمستی اور رنگینی، بیباکی، گستاخی اور بدتمیزی سے بالکل مختلف ہیں، اسلیے شراب وکباب کے مضامین میں بہتر تو یہی ہے کہ مذہب واخلاق سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، اور اگر کیا بھی جائے تو اس کو الحاد و بیدینی کی حد تک نہ پہنچایا جائے، مثلاً

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں | کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے | مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

لیکن امیر مینائی نے اس مضمون کو ایک شعر میں بالکل ملحدانہ طریقہ پر ادا کیا ہے،

جائے میخانہ بنی ہے مسجد | کبھی گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں

اور اس طریقۂ ادا میں بیباکی، گستاخی اور بدتمیزی کے سوا جوش و سرمستی کا کہیں پتہ نہیں، ریاض کے خمریات میں بھی ہم کو جوش و سرمستی اور لطافت اور رنگینی کے بجائے زیادہ تر بیباکی ہی بیباکی نظر آتی ہے، مثلاً

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے | پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

نظر بچائے بغل میں دبائے شیشۂ مے | کہیں ریاض بھی پینے پلانے جاتے ہیں

کیا جام دیا ہے مجھے کیا جام دیا ہے | ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو

دیدے، دیدے مرے ساقی ترے صدقے دیدے | دستِ رنگیں سے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

جنابِ شیخ نے جب پی تو مونہ بنا کے کہا | مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

اسی سلسلے میں زاہدوں اور واعظوں پر بھی آوازے کسے جاتے ہیں، اور ان کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں، لیکن اگر زاہدوں اور واعظوں کے حقیقی عیوب کھولے جائیں تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، البتہ اگر ان غریبوں پر محض اس لیے کہ وہ زاہد و واعظ ہیں پھبتیاں کہی جائیں تو بے شبہہ یہ ایک قابلِ اعتراض بلکہ قابلِ اصلاح بات ہے، مولانا حالی اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ذوق کے اس شعر میں

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو | تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس خصلت کی طرف اشارہ ہے جو اکثر زاہدوں اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو ذرا ذرا سے قصور پر ملامت کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور ہو کر باطن کی اصلاح سے غافل رہتے ہیں، لہٰذا اس طرزِ بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، مگر دوسری جگہ وہ اس طرح فرماتے ہیں،

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر | وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گلرنگ سے

لیکن اس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اس کے کہ شیخ شیخ ہے، نہیں جتلایا گیا اور شعر میں اس کے سوا اور کوئی خوبی نہیں رکھی گئی کہ ایک مقدس آدمی پر دو پھبتیاں کہکر بھنگڑوں اور شرابیوں کی ضیافتِ طبع کی جائے، اس لیے اس قسم کے اشعار کی وقعت سعدی

اور سوزنی کے ہزلیات سے زیادہ نہیں ہے، لیکن ریاض کے خمریات میں زاہدوں اور واعظوں پر جو چوٹیں کی گئی ہیں، اس میں اس سے بھی زیادہ بے اعتدالی پائی جاتی ہے، مثلاً

بانس پر میکدہ میں تجھکو چڑھا لے شیخ پھر بھی اونچے تری مسجد کے منارے نکلے

اک ٹپ ماری زور سے زاہد کے اے ریاض اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

اس کے علاوہ ان کے عاشقانہ کلام میں بھی بہت زیادہ عریانی پائی جاتی ہے، مثلاً

مجھے تو ہائے حسینوں پر رحم آتا ہے کبھی نہ چین سے راتوں کو اپنے گھر میں رہے

اس شعر میں حسینوں سے طوائفیں مراد ہیں، غرض اس قسم کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے باوجود صفائی اور برجستگی کے امیر کے تلامذہ میں ہم جلیل اور حفیظ کو ان پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن داغ اور جلال کے شاگردوں کی حالت امیر کے شاگردوں سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ داغ اور جلال کا رنگ خود اس قدر ترقی یافتہ تھا کہ ان کے تلامذہ کے لیے اس میں کسی قسم کی ترقی کی گنجایش ہی نہیں تھی، ان کے فخر کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ انھوں نے اس رنگ کو قائم رکھا، اور اس کی تقلید کرتے رہے، اس لیے ہم کو ان دونوں کے تلامذہ کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، مثالاً صرف ان کے چند منتخب اشعار سنا دیتے ہیں،

جلال کے تلامذہ میں ان کے خلف الصدق حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال، منشی احسان علی خاں شاہجہان پوری، اور سید انور حسین آرزو زیادہ نامور ہیں، اور ان کے کلام کے عمدہ سے عمدہ نمونے یہ ہیں،

میرے مرنے کی خبر اسکو پہنچنا ہے ضرور خیر اگر غمگیں نہ ہوگا شادماں ہو جائیگا کمال

مونہ پھیر کر کسی کا وہ جانا دم آخر یہ آخری ستم تھا جو عاشق پر اب ہوا

اندیشہ کیا ہو قتل کریں آپ شوق سے کل داد خواہ ہونگے نہ ہم داد خواہ آج

تلاش یار میں اک ہم ہیں اک دل بیتاب جنھیں سفر ہی میں گذری یہ دو مسافر ہیں

صبا و صرصر ادھر آکے کیا کریں پیم گل کسے بجھائیں چراغِ مزار بھی تو نہیں

ہوتی ہیں میرے سامنے میری برائیاں یہ غیر کی صفت نہیں جو غائبانہ ہو

برگشتہ بخت ہوتا ہے یوں آکے راہ پر لکھیں وہ خط کسی کو کسی کو روانہ ہو

ہوش آتا ہے شب غم جو ترے غافل کو غش یہ کہتا ہے ذرا آنکھ لگی رہنے دے احسان

بنگئی غیر انکو جب دیکھا نگاہ شوق نے مجھ سے بھی کہتی نہیں کس کی تماشائی ہوئی

خیالِ یار نہ آیا ہو بیخودی میں کہیں مجھے خبر ہی نہیں ہوشیار کس نے کیا

وعدے میں وہ رکتے ہیں تو کہہ دیتی ہے چتون گھبراتے ہو کیوں ہم تو مکرنے کے لیے ہیں

پوچھو نہ یہ آنسو مرے کیونکر نکل آئے تم آنکھ میں ٹھہرے تو یہ باہر نکل آئے

تیرے ہی کوچہ میں ہر پھر کے رہا میں آخر جستجو نے تری ہونے نہ دیا گم مجھ کو

اس کی تصویر سے ہے ہمسخنی کا اصرار بے زبانوں سے بھی ہے شوق تکلم مجھ کو

ہمارا گریۂ حسرت تھا بے اثر بالکل تمھیں ہنسا نہ سکا غیر کو رلا نہ سکا

وفا کا نقش ہے وہ نقش جو مٹکر ابھرتا ہے جنھیں دل سے بھلا دوگے وہ ہم یاد آئینگے آرزو

بڑی نعمت ہیں سوز جانگداز و دردِ بے درماں جب اُس عالم میں پہنچیں گے یہ عالم یاد آئینگے

تجربے تجربہ کاروں کے نہ کچھ کام آئے کہ نیا کار گہ عشق میں ہر کام ملا

ہم اور جو چپ رہتے کچھ دیر سر محشر ہر زخم دہن بنتا، ہر تیر زباں ہوتا

آنسو کہیں دامن پر، دامن کہیں کانٹوں پر ہر منزلِ حسرت میں عبرت کا نشاں میں تھا

کہتے یہ اور کچھ کہا نہ گیا کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے

ہم کسی کے ستائے ہیں تو ضرور تم نہیں ہو اگر تو قسمت ہے

کچھ اب تو کہنے لگی خود ہماری خاموشی
کہاں ہیں پوچھنے والے حکایتِ دل کے

جلال کے تلامذہ کا یہ منتخب کلام ہے، لیکن ان کے کلام کے مشترکہ اوصاف یہ ہیں، سادگی اور روانی، زبان میں صفائی اور شستگی، ہمواری اور یک رنگی، کسی قدر سوز و گداز، معشوق کے خارجی اوصاف، مثلاً زلف و گیسو، خط و خال، شانہ و آئینہ سے خالی اور معاملات و واردات عشق سے لبریز،

داغ کے تلامذہ میں بیخود بدایونی، بیخود دہلوی، نسیم بھرتپوری، نوح ناروی، سائل دہلوی، حسن بریلوی، آغا شاعر دہلوی، بیباک، حیرت، آزاد، رسا، فیروز شاہ رامپوری، احسن مارہروی، اور اشک وغیرہ مشہور ہیں، اور ان میں بعض صاحب دیوان بھی ہیں، اور سب نے داغ کے رنگ کو کم و بیش قائم رکھا ہے، ہم ہر ایک کے دو دو چار چار شعر بطور مثال کے نقل کرتے ہیں۔

نصیحت کی بھی حد ہوتی ہے کوئی حضرت ناصح
بس اب سمجھا چکو تم ورنہ تم کو ہم سمجھتے ہیں — بیخود بدایونی

ادا دیکھو کہ پردے میں نگاہیں ہم سے لڑتی ہیں
حیا دیکھو بھری محفل میں پردا ہم سے ہوتا ہے

ہم نے دیکھا ہے زمانہ ہم نے دیکھے ہیں حسیں
بندہ پرور ظلم کی کثرت کہیں اتنی نہیں — بیخود دہلوی

پہلے دیکھی غور سے تصویر یوسف پھر کہا
جتنی دیکھت میں ہو اچھی دلنشیں اتنی نہیں

سوال وصل پر کچھ سوچ کر اس نے کہا مجھ سے
ابھی وعدہ تو کر سکتے نہیں ہیں ہم مگر دیکھو

ہر ایک بات تری بے ثبات کتنی ہے
پلٹنا بات کو دم بھر میں بات کتنی ہے

اور پھر کس کو کہیں حال پریشانیٔ دل
تم تو ہوتے ہو پریشان بڑی مشکل ہے — نسیم بھرتپوری

روز کہتے ہو کہ تو کس کے لیے ہے بیتاب
جان کر بنتے ہو انجان بڑی مشکل ہے

دوستی سہل نہیں اس بت بدخو کی نسیم
ضد نہ کر دیکھ کہا مان بڑی مشکل ہے

یہ کیا کہ ابھی آئے، ابھی جانے کو تیار
ٹھہرو کوئی ساعت، کوئی لحظہ، کوئی دم بھی — نوح ناروی

کوئی لے جائے اب کہاں دل کو
ہر جگہ چھین چھپان ہوتی ہے

کل کہی تھی جو بات خلوت میں
آج سب میں بیان ہوتی ہے

ایسے سے دل کا حال کہیں بھی تو کیا کہیں
جو بے کہے، کہے کہ چلو بس سنا سنا — حسن بریلوی

وہ اگر یاد کریں ہم کو تو بھولیں کس کو
ہم اگر ان کو بھلائیں تو کسے یاد کریں

اب تو راضی ہو کہ ہم جینے سے بیٹھے ہیں خفا
اب تو خوش ہو کہ تمھارا ہی کہا کرتے ہیں

بڑا ہی تیر مارا آنکھ اٹھا کر مجھ کو کیا دیکھا
یہ کچھ منت ہو منت میں یہ کچھ احسان ہو احساں میں — حیرت

چاہا تمھیں خطا ہوئی فرمایئے معاف
ہوتا ہے آدمی ہی سے آخر گناہ بھی

ان کی یہ خوبیٔ اخلاق کہ وعدہ تو کیا
میری یہ شومیٔ تقدیر کہ ایفا نہ ہوا — رسا

یوں ہم نے چھپائی ہے ترے وصل کی حسرت
جس طرح چھپاتا ہے خطاوار خطا کو

سب قصہ سن کے عوض تمنا پہ یہ کہا
بس ہو گیا دماغ پریشان چاہیے

غیروں سے تم بڑھاؤ گے اور ارتباط کیا
تحفے گئے، پیام گئے، نامہ بر گئے — احسن مارہروی

تمھیں اور ہیں کون بہکانے والے
یہی آنے والے، یہی جانے والے

ازل سے ہوتی آئی ہے ابد تک ہوتی جائے گی
یہ حسن و عشق کی تکرار بھی تکرار کیسی ہے

اخیر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ ہم داغ، امیر اور جلال سب کے تلامذہ کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک جس طرح جلال کو داغ اور امیر پر ترجیح ہے، اسی طرح جلال کے تلامذہ کو بھی ہم داغ و امیر کے تلامذہ سے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے الفاظ و معانی دونوں میں متغزلانہ شان پائی جاتی ہے، اور یہ بات داغ اور امیر کے تلامذہ کو نصیب نہیں،

اس دور میں غزل کے سوا شاعری کی کسی صنف نے ترقی نہیں کی، بلکہ ان میں انحطاط آ گیا، اس تاریخی نکتہ کو اس لیے پیش نظر رکھنا چاہیے کہ شعرائے دور جدید کا

زمانہ اسی دور کے بعد آیا ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس تغزل کو اور بھی زیادہ ترقی دی ہے، اور شاعری کے تمام اصناف یعنی قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ کو چھوڑ کر بہت محدود قسم کی شاعری پر اپنا زورِ طبع صرف کیا ہے،

شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے کلام کا یہ ایک نہایت اجمالی موازنہ ہے، تفصیلی موازنہ کے لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے کلام کے دو بہترین انتخاب الگ الگ کیے جائیں، اور یہ دیکھا جائے کہ تغزل کے بہترین اشعار کس کے یہاں زیادہ ملتے ہیں، یہ ایک ادبی اور تنقیدی ضرورت ہے، جس کو ہم سے بہتر کوئی دوسرا شخص پورا نہیں کر سکتا، بشرطیکہ موت ہم کو اس کی فرصت و اجازت دے،

عہد مغلیہ کا نظام منصبداری

از جناب سید امین الدین الحسینی حیدرآباد دکن

منصب کی تعریف

یہاں منصب سے مراد قطعاً وہ منصب نہیں ہے جو حیدرآباد میں رائج ہے، یعنی کسی شخص کو اس کی خاص خدمات یا مذہبی فرائض کی انجام دہی یا کسی معاوضہ یا دعا گوئی وغیرہ کے صلے میں بشکل نقدی دیا جاتا ہے، بلکہ وہ ایک خدمت یا اعزاز یا ایک فوجی اصطلاح ہے، جو شاہان سلف کی جانب سے کسی عہدہ دار کو دیا جاتا تھا، اور اسی اعزاز کے لحاظ سے اس عہدہ دار کی تنخواہ بشکل نقدی یا بصورت جاگیر دی جاتی تھی، اور فوج کی تعداد بھی ایک خاص اصول کے تحت معین کر دی جاتی تھی، اور ایسا عہدیدار جس کو منصب عطا ہو "منصب دار" کہلاتا تھا، مثلاً منصب دار پنجہزاری ذات و پنجہزار سوار،

منصب کے لغوی معنی ہیں ایسا مقام جہاں کوئی چیز قائم کی جائے، گویا یہ ایک ایسا مقام یا معیار ہے جس کے لحاظ سے ہر منصب دار کی تنخواہ کی قرارداد اور فوج کی تعداد کا تعین کیا جاتا ہے،

سلطنت مغلیہ کے نظم و نسق کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ تمام سول عہدیدار عام اس سے کہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب کے سب فوجی عہدیداروں سے منتخب کیے جاتے تھے شہنشاہ اکبر نے کچھ ایسے اصول مرتب کیے تھے کہ صاحب سیف بھی صاحب قلم کی جگہ بآسانی منتقل کر دیا جاتا تھا،

یہ قیاس درست نہیں ہے کہ ہر صاحب منصب فوجی ہوتا تھا، کیونکہ بعض ایسے منصب دار بھی تھے، جو تھے تو منصب دار لیکن انھیں فوج سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ وہ سواری رکھتے تھے۔

اروِن (Irvine) کا خیال ہے کہ منصب نہ صرف فوجی ملازمین کے لیے مختص تھا، بلکہ ہر ملازم سرکار جو معمولی سپاہی سے زیادہ پوزیشن رکھتا تھا، اس کو منصب دیا جاتا تھا، اس لیے منصب دار فوجی اشخاص کے سوا مذہبی فرائض انجام دینے والے اشخاص بھی ہوتے تھے، مثلاً ترولی خادم، قاضی، محتسب و مفتی وغیرہ منصب دار ہوتے تھے، لیکن انھیں گھوڑے وغیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی،

منصب کی قدامت | نظام منصب داری کا وجود ہندوستان میں شیر شاہ کے عہد سے پایا جاتا ہے، بدایونی نے داغ وہی کے ضابطے کو اس سے بھی زیادہ قدیم العہد علاء الدین خلجی سے منسوب کیا ہے، اور "نظم و نسق سلاطین دہلی" کے مصنف قریشی صاحب نے تو طریقہ "داغ دہی" کو بنی امیہ کے عہد سے متعلق کر دیا ہے، لیکن فیروز شاہ نے ضابطہ داغ دہی کے ساتھ چہرہ نویسی کو بھی متروک کر دیا، البتہ سکندر لودھی نے چہرہ نویسی لازم کر دی، پھر شیر شاہ کے عہد میں اس ضابطے کا احیاء ہوا، بابر کو تنظیم فوج کا موقع نہیں ملا، اس لیے اس کے سوانح میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا، اکبر کے ابتدائی دور میں فوجی نظام درست نہیں تھا، منصب دار یا تو عیش و عشرت میں مبتلا یا فوجی تنظیم کے بجائے دولت جمع کرنے میں مشغول رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی، اس لیے جدید قواعد کے تحت ہر منصب دار اس کا پابند کر دیا گیا کہ وہ بلا کسی مراعات کے بلحاظ منصب گھوڑے ہاتھی، خچر، اونٹ اور حمل و نقل کی گاڑیاں مع ساز و سامان و اسلحہ مقررہ تعداد میں مہیا کیے، اور تنخواہ پائے،

داغ و تصحیح کی سخت پابندیوں نے بڑے بڑے جاگیرداروں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا، لیکن جلد ہی ان پر قابو حاصل کر لیا گیا،

عطاے منصب کا دستور | اولاً امیدوار منصب درباری امراء میں سے کسی کو اپنا مربی بناتا، پھر اسکے

توسط سے بخش الملکی کے یہاں رسوخ پیدا کر کے شہنشاہ کے حضور میں درخواست پیش کرتا، شہنشاہ بعد ملاحظہ امیدوار کا معائنہ فرماتے، اس کے بعد ایک کیفیت مرتب کی جاتی جو "حقیقت" کہلاتی تھی، جس میں یہ بتایا جاتا کہ امیدوار حسب الحکم حاضر خدمت ہوا تھا، اب عطاے منصب کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے، بعد ملاحظہ بادشاہ امیدوار کی شخصیت، وجاہت و شہرت نیز تعلقات و اثرات اور تابینان کی تعداد کے لحاظ سے عطاے منصب کا حکم صادر کرتا، اگر عطاء بشکل نقد ہوتی، تو اس میں تنخواہ کی تفصیل بھی ہوتی، اور اگر بشکل اراضی ہوتی تو محاصل کے علاوہ اراضی کا مقام عطاء یعنی موضع و پرگنہ و سرکار و صوبہ کا نام ہوتا، اس کے بعد ذیلی مراحل طے ہوتے، مثلاً تصدیق، یادداشت اور ڈول مرتب کیا جاتا، اور متعلقہ رجسٹر میں منصب دار کا داخلہ کیا جاتا، اور بادشاہ کا حکم توثیقی حاصل کیا جاتا، اس کے بعد منصب دار اور اس کے سواروں کا حلیہ ترتیب دیا جاتا اور بلحاظ منصب اس کے جملہ جانور گھوڑے، ہاتھی، اونٹ خچر اور حمل و نقل کی گاڑیوں اور اسلحہ وغیرہ کا معائنہ کیا جاتا، اور جانوروں کی باضابطہ داغ دہی کی جاتی، منصب ہر قوم کے افراد کو عطاء کیا جاتا تھا، کسی خاص فرقے یا نسل کی قید نہ تھی، مثلاً فوج اور سول میں مسلمان، ہندو، انگریز وغیرہ سب ہی شامل تھے،

حلیے کی ترتیب | داغ و تصحیح کے علاوہ منصب دار اور تابینان کی ترتیب حلیہ کے خاص خاص اصول تھے، حلیے میں نام، ولدیت عمر و قد و قوم (مع ذیلی تقسیم) سکونت، چہرہ کی خاص خاص علامات مثلاً داغ چیچک و خال و زخم شمشیر وغیرہ کی صراحت کی جاتی، اسی طرح جانوروں بلکہ اسلحہ اور پالکی اور میانہ کے حلیے تک مرتب کیے جاتے، اگر ان میں کسی قسم کا نقص یا تعداد میں کمی واقع ہوتی تو اس کا اثر منصب دار کی تنخواہ پر پڑتا،

منصب داروں کے مدارج | دورِ اکبری میں منصب داروں کے تین مدارج رکھے گئے تھے، اولاً

وہ منصب دار تھے جو پنجہزاری سے زیادہ منصب پاتے تھے، ان میں اول، دوم، سوم کا امتیاز نہیں رکھا گیا تھا، بلکہ کل کے کل درجۂ اول کے منصب دار سمجھے جاتے تھے، اور پنجہزاری کے نیچے کے منصب دار اول، دوم، سوم میں تقسیم کیے گئے تھے، مثلاً ایسا منصب دار جس کا منصب سوار منصب ذات کے مساوی ہوتا، وہ درجۂ اول کا منصب دار کہلاتا، جس کا منصب سوار منصب ذات سے کم ہوتا لیکن نصف سے کم نہ ہوتا، وہ منصب دار درجۂ دوم اور جو نصف سے کم ہوتا وہ درجۂ سوم ہوتا، اسی لحاظ سے ان کی تنخواہوں میں بھی تفاوت رکھا گیا تھا، اور ان کی تفصیلات سیاق نامہ اور آئین اکبری اور دستور العمل وغیرہ سے مل سکتی ہیں،

ذات وسوار کی تشریح اس بارہ میں مختلف اصحاب فکر نے مختلف رائیں قائم کی ہیں، مثلاً پنجہزاری ذات و پنجہزاری سوار کی نسبت بلاک من (Blochmann) مترجم آئین اکبری کا خیال ہے کہ لفظ "ذات" کے ساتھ جو تعداد بتائی گئی ہے، وہ ایک اعزازی اور غیر حقیقی ہے، یہ نہ کوئی رقمی ہندسہ ہے اور نہ گھوڑوں کی تعداد، البتہ ہر منصب دار سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے اعزاز و وقار کے بموجب کچھ گھوڑے وغیرہ رکھے، اس کے برخلاف "سوار" کے ساتھ جو تعداد بتائی گئی ہے، وہ ان کی حقیقی تعداد ہے، جو کسی منصب دار کو لازماً مہیا کرنی پڑتی تھی، لیکن اردن مصنف "دی آرمی آف دی مغلس" کی رائے بالکل اس کے متضاد ہے، وہ لکھتے ہیں "ذات" سواروں کی حقیقی تعداد کو ظاہر کرتا ہے، چنانچہ ہر منصب دار کا فرض تھا کہ وہ منصب ذات کے لحاظ سے سواروں کی مقررہ تعداد اور دوسرے جانور اور حمل و نقل کی گاڑیاں وغیرہ فراہم کرے اور سوار محض ایک اعزاز ہے، البتہ منصب دار کچھ زاید سواروں کا بھی انتظام کراتا تھا، ترپاٹھی (Tripathe) کا خیال ہے کہ سوار ایک مرغ ادہے جس کے لئے سرکار سے علحدہ الاؤنس دیا جاتا تھا، لیکن منصب دار مجبور نہ تھا کہ اس قدر سوار رکھے،

منوشی (Manucci) لکھتے ہیں کہ ذات سے مراد منصب دار کی تنخواہ ہے، [illegible] صاحب کی رائے ہے کہ ذات پیدل فوج کو ظاہر کرتی ہے، اور سوار، سوار فوج کو، لیکن عبدالعزیز صاحب بار ایٹ لا مصنف "منصب داری سسٹم" فرماتے ہیں کہ ایک منصب دار جو ذات و سوار کا اعزاز رکھتا تھا، وہ ایک خاص شرح کے تحت تنخواہ پاتا تھا، اور اس کو چند جانور اور حمل و نقل کی گاڑیاں رکھنی پڑتی تھیں، لہٰذا وہ تعداد جو ذات اور سوار کے ساتھ ملحق رہتی ہے وہ ایک گریڈ ہے جس کے ذریعہ تنخواہ کی قرارداد کی جاتی ہے، اور منصب دار کو چند شرائط کا پابند کر دیا جاتا ہے، آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ وہ منصب "منصب ذات" سے اس لیے موسوم ہے کہ وہ شخص اپنی تنخواہ سے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے اخراجات برداشت کرتا ہے، برخلاف اس کے سوار فوج کو مزید تنخواہ ملتی ہے، ان تمام بیانات اور خصوصاً شاہجہانی دور کے کاغذات کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ذات و سوار کے معمے کو جس خوبی سے بیرسٹر صاحب نے حل کیا ہے وہ بڑی حد تک تشفی بخش ہے،

منصب کی دیگر تقسیمیں ایسے منصب دار جن کے گھوڑے سرکار فراہم کرتی تھی، وہ داخلی منصبدار کہلاتے تھے، اور جو خود ہی فراہم کر لیتے وہ "واقعی" کہلاتے تھے،

منصب ذات و سوار کے علاوہ بعض ایسے مناصب بھی تھے، جو یک اسپہ، دو اسپہ سہ اسپہ کے عنوان سے منسوب ہیں، یہ ایک خاص امتیاز تھا جو سینیر اعلیٰ منصب دار کو عطا کیا جاتا تھا، اور بہت کم امرا اس اعزاز سے سرفراز ہوتے تھے، اس اعزاز کے عطا کے ساتھ ہی سوار فوج المضاعف ہو جاتی تھی، اور اس صورت میں منصب سوار منصب ذات سے متجاوز ہو سکتی تھی، اس کے علاوہ اور کسی صورت میں بھی منصب ذات سے منصب سوار متجاوز نہیں ہو سکتی تھی، اگرچہ یہ امتیاز دور اکبری سے منسوب کیا جاتا ہے، لیکن قریشی صاحب کی تصنیف

"سلاطین دہلی" میں بھی دو اسپہ کے الفاظ ملتے ہیں، اور بعض مقامات پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یک اسپہ دو اسپہ، سہ اسپہ سے یہ مطلب نہیں ہے کہ سپاہی ایک گھوڑا یا دو یا تین گھوڑے رکھتے تھے، بلکہ اس اعزاز والے کو تنخواہ نسبۃً زیادہ ملتی تھی، اور اس کو خاص مراعات دیجاتی تھیں،

منصب کے اقسام میں شرطی اور غیر شرطی بھی ہیں، شرطی وہ ہے جس سے کوئی نہ کوئی خدمت ضرور مشروط کر دی جاتی تھی، اور غیر شرطی منصب بلا شرط خدمت ہوتا،

شہزادگان اور امراے عظام کے مناصب

ہفت ہزاری اور اس کے اوپر کے مناصب شہزادگان کے لیے مخصوص تھے، اور ہفت ہزاری سے کم امراے عظام کے لیے، لیکن بعض اوقات خاص اور اہم خدمات کے صلہ میں ہفت ہزاری اور اس سے زاید مناصب بھی امرا کو عطا کیے گئے، مثلاً یمین الدولہ آصف خان خانان سپہ سالار کو نہ ہزاری ذات نہ ہزاری سوار دو اسپہ سہ اسپہ عطا کیا گیا تھا، شہزادگان کے مناصب حسب ذیل تھے،

عہد اکبری	شہزادہ سلیم	دوازدہ ہزاری ذات	دوازدہ ہزار سوار
"	مراد	نہ ہزاری "	ہفت " "
"	دانیال	ہفت ہزاری "	" " "
"	خسرو	" " "	"
عہد جہانگیری	پرویز	چہل ہزاری "	سی ہزار
"	خرم	سی ہزاری "	ہشت ہزار "
"	شہریار	دوازدہ ہزاری	ہیجدہ ہزار "
"	داور بخش	ہشت ہزاری	سہ ہزار "
"	مرزا شاہ رخ	ہفت ہزاری	

عہد شاہجہانی	دارا شکوہ	شصت ہزاری ذات	چہل ہزاری سوار دو اسپہ سہ اسپہ
"	اورنگزیب	بست ہزاری "	پانزدہ ہزار سوار دو " سہ "
"	مراد	پانزدہ ہزاری "	دوازدہ ہزار سوار دو " سہ "
"	شجاع	ہشت ہزاری "	پانزدہ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ
عہد اورنگزیبی	محمد معظم شاہ عالم	چہل ہزاری "	چہل ہزار سوار
"	کام بخش	" " "	" "
"	محمد سلطان	بیست ہزاری "	بست ہزار "
"	اعظم	" ہزاری "	نہ ہزار "
"	اکبر	دہ ہزاری "	دو ہزار "

منصب دار کے لوازمات

ہر منصب دار کو اپنے تابینان کے علاوہ ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، خچر وغیرہ بھی رکھنے پڑتے تھے، مثلاً پنجہزاری منصب دار کے لیے حسب ذیل لوازمات ضروری تھے، اور اس کو ماہانہ تنخواہ تیس ہزار روپیہ ملتی تھی،

۳۴	عراقی گھوڑے	۳۰ ہاتھی	سادہ
۳۴	مجنس "	۲۰ "	منجھولہ
۶۸	ترکی "	۲۰ "	کرہ
۶۸	یابو "	۱۰ "	پندکرمہ
۶۸	تازی "	۸۰	اونٹ
		۲۰	خچر
		۱۶۰	باربرداری کی گاڑیاں

ایک محقق نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ مذکورۂ بالا جانور وغیرہ سب کے سب منصب داری کے ضروری لوازم نہیں تھے، بلکہ ان میں سے کچھ جانور بادشاہ کی خاص ملک متصور ہوتے تھے، جو دواب شاہی کے نام سے موسوم تھے، ان کے مصارف کے لیے تنخواہ بھی ملتی تھی، جو ذات میں شامل رہتی تھی۔

عطاء مناصب کے مواقع اور لوازمات جشن سالگرہ وغیرہ کے مواقع پر حسب ذیل لوازم شاہی منصب دار کو بلحاظ اعزاز و وقار عطاء ہوتے تھے۔

خطاب، خلعت، لباس، جواہرات، اسلحہ، پالکی، میانہ، ہاتھی، گھوڑے، علم، نقارہ، نوبت، شاہی دواب،

ترغیب و تشویق اور ہمت افزائی کی خاطر منصبداروں کو تنخواہ کے علاوہ انعامات بھی دیے جاتے تھے، اور اگر امیر کو مفوضہ خدمت دور دراز مقام پر انجام دینی پڑتی تو معقول الاؤنس بھی دیا جاتا تھا، اور کچھ رقومات بطور مساعدت یا دست گرداں بھی دی جاتی تھیں جن کی ادائی حسب ضابطہ بالاقساط ہوتی۔

منصبداروں کے ساتھ دیگر مراعات منصبداروں کو دوسری مراعات بھی دیجاتی تھیں، مثلاً مختلف قسم کی رخصتیں وہ حاصل کرسکتے تھے، رخصت علالت، رخصت جاگیر و رخصت برائے زیارت مقامات مقدسہ وغیرہ، ہر منصبدار اپنے اعزاز کے موافق شاہی دربار میں ایک خاص مقام رکھتا تھا، جہاں وہ کھڑا ہوتا تھا۔

منصبداروں کی تنخواہیں بلاکمن کا خیال ہے کہ آئین اکبری میں جو تنخواہیں درج ہیں وہ منصب ذات سے متعلق ہیں، اور منصب دار کی تنخواہیں شاہی یا مقامی خزانہ سے ملا کرتی تھیں، اروِن ڈاکٹر پارون کے اس بیان کی تردید کرتا ہے کہ سواروں کے اخراجات کی ادائی منصب ذات کی تنخواہ کیجاتی تھی، ٹرپی پیاٹھی لکھتے ہیں کہ اگر بلاکمن اور اروِن کے دعووں کو مان بھی لیا جائے تو فوج کی تنخواہوں کا مجموعہ اتنا زیادہ ہوجاتا ہے جو یقین کے قابل نہیں ہوسکتا، بہرحال تنخواہوں کا مسئلہ بالکل ہی راز میں ہے، جس کا حل دشوار طلب ہے۔

اکبری دور میں منصبداروں کی تنخواہوں کا معیار زیادہ تھا، جو بعد کے دور میں گھٹ گیا، اور منصبدار کو قانوناً یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے سواروں کی تنخواہ کا ۵ یا ۱۰ فیصدی اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرے، لیکن

شاہجہانی اور اورنگزیبی عہد میں تین یا چار سواروں کی تنخواہ سے دو یا تین سواروں کی تنخواہ منصبدار لیتا تھا۔

اروِن کا خیال ہے کہ چند منصبداروں کو بارہ مہینہ کی تنخواہ ملتی تھی، اور بعض کو اس سے کم چار ہی مہینہ کی، لیکن یہ دعوی بلادلیل ہے، البتہ ابوالفضل کے بیان کے موافق یہ خیال صحیح ہوسکتا ہے کہ ہر سال ایک ماہ کی تنخواہ ہر منصبدار کے گھوڑوں اور ان کے ساز و سامان کے سلسلے میں وضع ہو جایا کرتی تھی۔

تنخواہ گھوڑوں کی تعداد کی مالیت کے لحاظ سے جاری کیجاتی تھی، اور ہر منصبدار پر لازم تھا کہ وہ اپنے منصب ذات و سوار کے لحاظ سے حسب ضابطہ حمل و نقل کے جانور، گھوڑے گاڑیاں، ہاتھی، اونٹ وغیرہ رکھے، اسکے علاوہ بعض منصبداروں کی تحویل میں شاہی ہاتھی اور گھوڑے وغیرہ بھی رکھے جاتے تھے، جنکے اخراجات گورنمنٹ برداشت کرتی تھی،

اگرچہ جہانگیری اور شاہجہانی عہد میں عطائے مناصب کی بوچھار رہی، اسی لیے انکی تنخواہوں میں کمی ہوگئی، منصبداران نقدی کو انکے مناصب کے موافق نقد تنخواہ دیجاتی تھی، اور جاگیری منصبدار اپنی جاگیر سے مقررہ محاصل وصول کرلیتا تھا، جاگیردار کو صرف فراہمی محاصل کی حد تک اقتدار حاصل تھا، اس کے علاوہ اور اختیارات حاصل نہیں تھے، بعض یورپین مصنفین نے غلط فہمی کی بنا پر یورپ کی طرح جاگیردار کو مقتدر تسلیم کیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔

داغ دہی کے ضابطے منصبداروں کے تقرر کے بعد ان کے پیش کردہ جانوروں کی داغ دہی مقررہ قوانین کے تحت عمل میں آتی تھی، تاکہ کوئی منصبدار فرضی جانور نہ رکھ سکے، قانون داغ کے مطابق ایک سے زیادہ داغ دیے جاتے تھے، اگر کوئی منصبدار مقررہ وقت پر اپنے گھوڑوں کو داغ دلانے سے قاصر رہتا تو بطور جرمانہ اسکی جاگیر یا تنخواہ سے کچھ حصہ وضع کرلیا جاتا، اور اگر کسی منصبدار کی جاگیر زیادہ فاصلے پر واقع ہوتی تو اس کو رعایۃً کچھ مہلت دیجاتی، اور اگر کسی منصبدار کے منصب سواران میں اضافہ ہوتا تو داغ دہی کی تکمیل تک تنخواہ کا اضافہ روک لیا جاتا، البتہ ذات کی تنخواہ تاریخ اضافہ ہی سے جاری ہوجاتی، اکبری عہد میں منصب سوار کی مقررہ تعداد سے کم رکھنے کی اجازت نہ تھی، البتہ شاہجہانی دور میں یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی کہ اگر منصب دار کی خدمت اسی کی جاگیر ہی میں ہو

انجام دینی پڑتی تو منصب سوار کا ½ حصہ مستوجب داغ ہوتا، ورنہ ⅓، اور اگر ملازمت زیادہ فاصلے پر مثلاً بلخ بدخشاں میں انجام دینی پڑتی تو صرف ¼ کی حد تک داغ دہی لازمی تھی، البتہ خاص منصبدار داغ دہی کے ضابطے سے مستثنیٰ تھے۔ مثلاً عالمگیری عہد میں تمام راجپوت سردار مستثنیٰ تھے، اس کے بعد سہ ہزاری زیادہ سوار بھی مستثنیٰ قرار دیے گئے، اگر منصبدار اپنے فرائض منصبی کو محنت اور خوبی سے انجام دیتے تو ان کو اعلیٰ مناصب پر ترقی دیجاتی ورنہ تنزل یا برطرف کر دیے جاتے،

خدمات منصب

منصب فوجی اغراض کے علاوہ حسب ذیل خدمات کے لیے بھی منصب عطا ہوتا تھا مثلاً شعرگوئی، قصہ گوئی، تعلیم و تدریس، مصوری، مطبخ، فراش خانہ، زرگر خانہ، کتب خانہ، شربت خانہ، احتساب، افتا، آبپاشی، کوٹھ جات، اصطبل، اتباع، مالگذاری، بازارات وغیرہ

منصبداروں کی تنخواہوں کی خاص منہائیاں

ہر نقدی منصبدار سے اس کی تنخواہ کی ادائگی کے وقت حسب ذیل امور کی بابت کچھ رقم بحق سرکار، وضع کرلی جاتی تھی،

(۱) قصور دو دوامی (۲) حصہ اجناس

(۳) حصہ ارماس (۴) صرف سکہ

(۵) ایام ہلالی (۶) خوراک دواب

منصب داروں کی جائداد کی ضبطی

منصب دار کی وفات کے بعد دیوان بیوتات کا فرض تھا کہ وہ قاعدہ کے مطابق فوراً متوفی کی جائداد کو ضبط کر کے مہر توڑ کر دے، اور بعد تحقیق سرکاری مطالبات کی ادائگی کے بعد باقی حصہ ورثہ کے حوالے کر دے، اکبر کے زمانہ میں متوفی منصب دار کی اولاد کی خاص طور پر حفاظت کی جاتی اور حکومت کی نگرانی میں ان کی پرورش اور تربیت ہوتی تھی، اور متوفی کی بیوہ اور لڑکیوں کے نام رعایتی وظیفے جاری کیے جاتے تھے،

حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہؒ

از

جناب شیخ فرید صاحب لکچرار رابرٹسن کالج جبلپور

دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں سیاسی انقلابات اور اس سے پیدا شدہ انتشار اور طوائف الملوکی کے باعث سندھ کے اکثر علماء اور فضلاء اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ہجرت کر گئے، ان انقلاب زدگان میں ایک بزرگ نامور خاندان حضرت شیخ قاسم کا بھی تھا، جو احمد آباد اور ایلچپور ہوتا ہوا برہان پور کی سرزمین میں آکر اقامت پذیر ہو گیا، اس خاندان کے قدیم شجرہ[1] میں دوسرے افراد کا سیوہان اور پاتر (سندھ) اور عربستان میں ہجرت کر کے مقیم ہونا بتلایا گیا ہے،

اس مضمون میں شیخ قاسم کے خلف الصدق حضرت شاہ عیسیٰ[2] کا تذکرہ مقصود ہے،

نام و نسب

شیخ عیسیٰ نام، ابوالبرکات کنیت، جنداللہ، عین المعرفا، مسیح الاولیاء لقب، اور جندی تخلص ہے،

شیخ اسماعیل فرحی نے کشف الحقائق[3] میں جو سلسلۂ نسب بیان کیا ہے وہ حضرت شہاب الدین

---

[1] شجرۂ خاندان حضرت قاسم (مملوکہ حکیم لاڈلے صاحب ملکاپوری)، [2] یہ مضمون راقم السطور کے مقالہ "برہان پور کا فارسی ادب" کا ایک جزو ہے، جو کل ہند تعلیمی کانفرنس ۱۹۵۰ء ناگپور میں پڑھا گیا تھا، اس مضمون کی تیاری میں تمام مخطوطات حضرت مولوی سید احکام اللہ صاحب بخاری کے کتبخانے کے استعمال کیے گئے ہیں، احقر موصوف کے کرم خاص کے لیے سراپا سپاس ہے، [3] کشف الحقائق ورق ۴

سندھی تک پہنچتا ہے۔

آبائی وطن

حضرت شیخ عیسیٰ کے آباء واجداد کا وطن قصبۂ پات (سندھ) تھا، اس قصبہ کی بنا وآبادی میں ان بزرگوں کا مقدس ہاتھ تھا، اور ان کے قدوم کی برکت سے اس کی آبادی اور ترقی میں برابر اضافہ ہوتا رہا[1]،

ہمایوں کی شکست کے بعد جب سندھ کی ابتری اور بدنظمی کی وجہ سے ہزاروں باعزت اور بزرگ خاندان اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے، تو شیخ قاسم اپنے برادر بزرگ شیخ طاہر محدث کے ہمراہ اپنے وطن مالوف سے نکل کر احمد آباد پہنچے،

قیام احمد آباد

شیخ طاہر کچھ عرصہ کے لیے احمد آباد میں مقیم ہوگئے، احمد آباد میں ان کے زمانۂ قیام کی تعیین مشکل ہے، یہاں آنے کے بعد مشہور بزرگ حضرت محمد غوث گوالیاری کے زیر تربیت مراتب عالیہ طے کیے اور خلافتِ شطاریہ سے سرفراز ہوئے[2]،

ایلچ پور میں قیام

پھر اپنے اعزا اور اقرباء کے ساتھ احمد آباد سے ایرج پور[3] ایلچ پور (برار) پہنچے، یہاں کے حاکم تفاول خاں کی عقیدت مندی نے ایلچ پور میں سکونت اختیار کرلے پر مجبور کردیا، آپ مدرسۂ عمادشاہیہ میں درس وتدریس میں مصروف ہوگئے، اور شہر کے عوام وخواص آپ سے مستفیض ہونے لگے۔

پیدائش اور تعلیم وتربیت

۵ ذی الحجہ یوم یکشنبہ ۹۶۲ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۵۵۴ء کو شاہ عیسیٰ پیدا ہوئے، شیخ طاہر محدث نے اپنے چچا میسحا کے نام کی مناسبت سے ان کا نام عیسیٰ رکھا، شاہ عیسیٰ کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے والد کے زیر سایہ ہوئی، نو سال کی عمر میں کلام اللہ

[1] کشف الحقائق ورق ۷، [2] احمد آباد میں قیام کی وجہ اور تفصیل قیام اور مراتب عالیہ طے کرنے کے بیان کے لیے ملاحظہ کیجئے، کشف الحقائق ورق ۷ [3] کشف الحقائق ورق ۸

حفظ کرلیا، پھر تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم اپنے عم محترم شیخ طاہر محدث سے حاصل کی،

حضرت شیخ قاسم کا انتقال اور برہان پور میں آمد

پانچ محرم ۹۸۱ھ مطابق پنجشنبہ ۳ مئی ۱۵۷۳ء کو شیخ قاسم کا ایلچپور میں انتقال ہوگیا[1]، اس حادثہ کے بعد شیخ طاہر محدث اپنے اعزا اور اقرباء کے ہمراہ ایلچ پور سے برہان پور چلے آئے، اور شہر کے شمالی حصہ میں سکونت اختیار کی، یہ حصہ علماء وفضلاء کی سکونت گزینی کے باعث "محلہ سندھیاں" کہلانے لگا اور اب سندھی پورہ کہلاتا ہے،

یہاں آنے کے بعد شیخ عیسیٰ حضرت شیخ یوسف برنگالی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور پانچ سال کے قلیل عرصہ میں جملہ علوم متداولہ میں مہارت حاصل کرلی اور پچیس سال کی عمر میں صاحب فضل وکمال ہوگئے،

ارادت وبیعت

علوم ظاہری میں تکمیل کے بعد طلب حق کا جذبہ پیدا ہوا، اور مرشد کامل کی تلاش میں[2] اکبرآباد روانہ ہوگئے، اور اجین، سارنگ پورہ اور گوالیار ہوتے ہوئے قاضی جلال الدین ملتانی کی خدمت میں آگرہ پہنچے[3]، کچھ دنوں تک ان سے استفادہ کیا،

جب ملا حکیم عثمان سندھی الصدیقی برہان پور آئے تو شیخ طاہر محدث نے شیخ عیسیٰ کو واپس بلالیا، ان سے انھوں نے علم قرأت حاصل کیا،

شاہ عیسیٰ نے بہت سے علماء سے علوم ظاہری حاصل کیے، مگر جس رہبر کی تلاش تھی وہ نہ ملا، آخرکار، شیخ محمد عارف کی خدمت میں پہنچے، اور چند ہی دنوں کی صحبت میں ان سے ارادت وعقیدت مضبوط ہوگئی، اور بیعت سے مشرف ہوکر دولتِ سرمدی سے فیضیاب ہوئے[4]،

[1] کشف الحقائق ورق ۸ [2] گلزار ابرار ورق ۳۴۱ [3] کشف الحقائق ورق ۸، برہانپور سے آگرہ تک سفر کی تفصیلات کیلیے ملاحظہ کیجئے، کشف الحقائق ورق ۱۰، ۱۱ [4] ارادت وبیعت کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے، کشف الحقائق ورق۔

حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد پیر کی خدمت میں رہ کر راہ سلوک طے کی اور دو تین
اربعین میں ان کا باطن گوناگوں تجلیات سے منور ہوگیا، ان تجلیات اور فیض باطنی کے اثرات انکی تمام
تصانیف[1] میں جلوہ گر ہیں،

فیض باطنی کے حصول کے بعد مرشد نے خلافت شطاریہ اور چودہ خانوادوں کی اجازت
اور خلافت سے سرفراز کیا، لیکن خاص سلسلہ شطاریہ تھا،

مرشد کا پورا نام اور لقب شاہ لشکر محمد عارف ہو اسلئے انھوں نے اپنا لقب "جند اللہ" اختیار کیا،
اور جندی تخلص کرتے تھے،

اس کے بعد اپنی بقیہ زندگی عبادت و ریاضت، درس و تدریس اور طالبانِ حق کی رشد و ہدایت
اور تہذیب و تربیت میں بسر کی

اکبر کا اسیر پر حملہ[2] جب اکبر نے ۱۰۰۸ھ میں اسیر پر حملہ کیا، تو بہادر شاہ فاروقی آخری فرمانروائے خاندان فاروقی
نے قلعۂ اسیر میں پناہ لی اور برکت کے لیے حضرت مسیح کو وہاں لے گیا،

اس سنگین قلعہ میں رسد کا کافی سامان تھا، اس لیے محاصرہ نے طول کھینچا، اکبر کو بتلایا گیا کہ
صاحب دعوت حضرت عیسیٰ قلعہ میں موجود ہیں، ان کی موجودگی میں قلعہ فتح ہونا مشکل ہو، اسلیے
اکبر ان سے بدظن ہوگیا، اور گیارہ مہینہ کے طویل محاصرہ کے بعد جب (۱۰۰۹ھ ۱۶۰۱ء میں) قلعہ فتح ہوا،
تو دوسرے محصورین کے ساتھ حضرت عیسیٰ کو بھی قید کر لیا گیا، اور اکبر نے حضرت کو ایک درباری
امیر کی نگرانی میں دیدیا، اس نے ان کو گھوڑوں کے اصطبل میں رکھا[3]، مگر ان کے حالات و تصرفات
سے واقف ہونے کے بعد جلد ہی ان کا معتقد ہوگیا،

---

[1] گل زار ابرار قلمی (۳۴۳ ورق) [2] اسیر اور اس پر اکبر کے حملہ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے،
راقم السطور کا مضمون اسیر (ہندی، انگریزی) [3] ثمرات الحیات ورق ۴۹،

آگرہ واپس ہوتے وقت اکبر نے ان کو حضرت شیخ بڈھ[1] کی سپردگی میں دیا، چند دنوں کے
بعد شیخ بڈھ نے اکبر سے حضرت عیسیٰ کے حالات بتلاتے وقت ان سے سوء ادب کی معافی چاہی اور
بکمال ادب ان کو رہا کر دیا،[2]

آگرہ سے واپسی کے بعد عمر عزیز کا باقی حصہ بھی طالبانِ رشد و ہدایت کی تربیت اور درس و
تدریس میں بسر کر دیا،

وفات ستر سال کی عمر میں ۱۵ شوال ۱۰۳۱ھ مطابق ۳۱ اگست ۱۶۲۲ء کو برہانپور میں جان عزیز
جان آفریں کے سپرد کر دی، (۱) فیض عالم اور (۲) ہادی اعظم سے تاریخ وفات نکلتی ہے، انکی وفات
پر ان کے ایک معتقد نے مرثیہ لکھا ہے، اس کو آیندہ صفحات میں نقل کیا جائے گا،

ان کا مزار سندھی پورہ میں ایک وسیع احاطہ میں ہے، جس کے گرد چہار دیواری ہے جو اب تک
زیارت گاہ خلائق ہے، مدرسہ اور خانقاہ کی عمارتوں کے آثار اب بھی باقی ہیں،

سیرت حضرت موصوف جامع کمالات متقی پرہیزگار، جید عالم اور توحید کے دلدادہ تھے،
ان کی سیرت سنت نبوی کا نمونہ تھی، ہر شخص سے اخلاص اور شفقت و محبت سے پیش آتے تھے،
آپ کی زندگی متوکلانہ تھی، مگر عام طور سے مشہور تھا کہ آپ کے پاس دولت ہے، اس غلط فہمی کی وجہ یہ
تھی کہ اکثر سندھی تاجر اپنا مال حضرت کا مال بتلا کر فروخت کرتے تھے، تاکہ محصلین اور چنگی والے ان کے
ساتھ رعایت کریں،

جو رقم بطور نذرانہ اور فتوح آتی تھی، وہ فقراء اور مستحقین میں تقسیم کر دیجاتی تھی، یہ خدمت میاں
شیخ محمد کے سپرد تھی، عبد الرحیم خانخانان اکثر نصف شب کے بعد نذرانہ بھیجتا تھا، حضرت موصوف اسی وقت
میاں شیخ محمد کو ان کے سپرد کر دیتے تھے،

---

[1] اصلی نام شیخ عبد اللہ تھا، شیخ محمد غوث گوالیاری کے صاحبزادے تھے [2] کشف الحقائق ورق ۵۵ [3] ایضاً ورق ۹۶

نذر کا معتد بہ حصہ مسجد اور مدرسہ کی تعمیر اور ضروریات پر بھی خرچ ہو جاتا تھا، اس کے بعد بہت کم بچتا تھا، ان کی وفات کے بعد قرض ان کے لڑکوں نے ادا کیا،[1]

خانقاہ کا ایک دستور العمل تھا، اور تمام درویش اس کے تحت زندگی بسر کرتے تھے، کچھ خانقاہ نشین جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے، ان کو بیچ کر زندگی بسر کرتے، کچھ کتابوں کی نقل اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ روزی پیدا کرتے اور بعض متوکلانہ زندگی بسر کر رہے تھے، بہت سے درویشوں کو روزانہ خانقاہ سے کھانا ملتا تھا،

حضرت کو اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں سے بڑی محبت تھی، ان سے کمال شفقت سے پیش آتے تھے، ان کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے، مریدوں کی باطنی اصلاح کیجانب خاص توجہ فرماتے تھے، امیر و غریب کے ساتھ مساویانہ سلوک تھا، آپ کی محفل میں عبد الرحیم خانخانان کو بھی فقراء پر ترجیح نہ دیجاتی تھی، آپ کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد خانقاہ میں آجاتے، مریدوں اور طالب علموں کو حدیث فقہ اور تفسیر وغیرہ کا درس دیتے، طریقۂ درس نہایت مؤثر تھا، آیات واحادیث اور اشارات و نکات کی تشریح دلنشین انداز میں بیان کرتے تھے جس سے آپ کے درس میں بڑی دلکشی پیدا ہو جاتی تھی، زیر بحث موضوع پر مفصل روشنی ڈالتے تھے، کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جاتا تھا، آپ کے علمی تبحر اور زہد و تقوی کا اتنا عالمگیر شہرہ تھا کہ دور دراز کے طلبہ آپ سے تحصیل علم کے لیے آتے، کشف الحقایق میں کابل اور سرندیپ تک کے طلبہ کا ذکر ہے،

اولاد و اعزہ | آپ کی اولاد میں دو صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی کا پتہ چلتا ہے، بڑے صاحبزادے شیخ عبد الستار (مدفون برہان پور) چھوٹے لڑکے شیخ فتح محمد محدث (مدفون مدینہ منورہ) صاحبزادی حضرت بی بی راستی۔ حضرت کے دو بھائی تھے، شیخ عثمان اور شیخ سلیمان، یہ دونوں سپاہی اور

[1] کشف الحقایق ورق ۹۹

حضرت شاہ لشکر محمد عارف کے مرید تھے، اور راجہ علی خان فاروقی (والی خاندیس) کے یہاں حفاظتی دستہ میں ملازم تھے، سلیمان عالم و فاضل اور شاعر تھے، سینی تخلص کرتے تھے، عین المعانی میں انکی کچھ رباعیات ملتی ہیں، دونوں بھائی راجہ علی خاں فاروقی کی طرف سے سہیل خاں دکنی کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے،[1]

خلفاء و معتقدین | آپ کے خلفاء میں حضرت برہان الدین راز الٰہی، ملا ابو الخیر لمجی، شیخ محمد صدیق، ملا عبد العزیز لاہوری، ملا یوسف، شیخ محمود، سید یعقوب مرزا فتح پوری، اسماعیل فرحی، عبد الستار، خلیل، میران عبد الرحمٰن، اور معتقدین میں نواب عبد الرحیم خانخانان، مرزا داراب خاں، عاقل خاں رازی، ملا شیخ عثمان، سنبل (غلام) قابل ذکر ہیں،

اسناد شاہی | شاہان مغلیہ نے حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ کی اولاد کی معاشی امداد کے لیے وقتاً فوقتاً جو اسناد عطا کی ہیں، ان میں سے دو نقل کیجاتی ہیں، پہلی سند شیخ فتح محدث کے نام سے ہے، اور شاہ جہاں کی عطا کردہ ہے،

اللہ اکبر

بہر ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ غازی دریں وقت فرمان عالی شان سعادت نشان شرف اصدار و عز ازدہ یافت کہ موضع کولی کھیرا من اعمال زین پور صوبۂ خاندیس در وبست پنج از حصہ از جملہ ششش حصہ ربیعی ...... در وجہ مدد معاش حقایق آگاہ معارف دستگاہ شیخ فتح محمد محدث ولد مرحوم شیخ عیسیٰ سندھی با فرزندان حسب الضمن مقرر تفویض باشد کہ محاصلات آں .... صرف معاش خود ہا نمودہ بدعاگوئی دوام دولت ابد پیوند اشتغال می نمودہ باشد می باید کہ حکام و عمال و جاگیرداران و متصدیان

[1] کشف الحقایق ورق ۱۲۱ الف

مہمات و کروڑیان حال و استقبال در استمرار و استقرار ایں حکم اعلیٰ اقدس کوشیدہ آں

موضع را در وبست بہ تصرف ....

....

بدان رانند ہند، و بہ علت حال وجوہات و اخراجات مثل قنلغہ و پیش کش و محصلانہ

و ہرانہ و داروغگاہ بیگار و شکار و دہ نیمے و صد دوے و قانون گوئے و دیش کھ

و دیش پانڈے و کل تکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی مزاحمت نرسانند، و دریں

باب بر سالہ فراز دیر و انچہ مجدد نطلبند و از ہرچہ تخلف نورزند

تحریر فی التاریخ

....

سند کا نقوط زدہ حصہ کرم خوردہ اور آب زدہ ہے۔

دوسری سند مسماۃ امت الجلیل بنت محمد بن شہاب الدین کے نام ہے،

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ شانہ

مہر	محمد معین الدین عالمگیر ثانی فرمان ابو ظفر پادشاہ غازی فرخ سیر

دریں وقت میمنت اختران فرمان والاشان واجب الاذعان عز صادر شد کہ موضع

کار کھیڑہ متعلق پرگنہ زین پور صوبہ خاندیس در وبست بجمیع چہل و ہشت ہزار دام کہ یکصد

و ہشت روپیہ کیپوری حاصل آنست از ابتدائے خریف تیلان ئیل (۲) در وجہ مدد معاش مسماۃ

امت الجلیل بنت محمد عبد اللہ نبیرۂ قدوۃ الواصلین شیخ عیسیٰ قدس سرہٗ بلا قید اسامی

و قسمت حسب الضمن مقرر باشد باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات و جاگیرداران و

دریان حال و استقبال موضع مذکور را بتصرف وابستہ ہائے مسماۃ مذکور بازگذارند

و از جمیع وجوہ و عوارض معاف و مرفوع القلم شمارند و دریں باب ہر سال سند مجدد نطلبند۔

سوم محرم الحرام سال دوم از جلوس والا

نوشتہ شد

تصانیف — حضرت مسیح الاولیاء کی حسب ذیل تصانیف اب تک معلوم ہو سکی ہیں،

(۱) روضۃ الحسنی (۲) عین المعانی (۳) انوار الاسرار (۴) جواہر پنجگانہ (۵) حاشیہ بر اشارات غوثیہ

(۶) شرح قصیدہ بردہ (۷) قبلۃ المذاہب اربعہ (۸) حاشیہ بر شرح عنیایہ (۹) تفسیر محمدی

(۱۰) تتمیم شرح مائۃ عوامل (۱۱) رسالہ عقود (۱۲) شرح دو رباعیات — اسرار الوحی

(۱۳) رسالہ دقیقہ (۱۴) مجمع البحرین

مذکورہ بالا تصانیف کے مطالعہ سے ان کے علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے، آپ کو تفسیر، حدیث،

فقہ، منطق، معانی، بیان، جملہ فنون میں عبور حاصل تھا، عروض اور شاعری میں ید طولیٰ رکھتے تھے،

جملہ اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے، معما گوئی اور تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا، آپ کی

اکثر تصانیف میں آپ کے اشعار ملتے ہیں، غالباً علیحدہ کوئی مجموعۂ کلام نہیں ہے، عاقل خان رازی

نے ثمرات الحیات[1] میں یک غزل نقل کی ہے،

اے طوطیٔ خوش گو بہ منقار دو عالم — شد آئینہ روے تو رخسار دو عالم

خواہی بہ رخِ خویش ز ہر گوشہ تماشہ — ورنہ غرضت چیست ز اظہار دو عالم

زلفِ سیہت در تتق غیب نہاں بود — ظاہر شدہ در کسوت اغیار دو عالم

آن جان جہاں کز خود و ز غیر نہاں بود — گشت است عیاں بر سر بازار دو عالم

جندی منشین جز مئے معشوق زمانے — چوں ہست دلت مخزنِ اسرار دو عالم

---

[1] ثمرات الحیات قلمی ورق ۵۳ الف

روضۃ الحسنیٰ۔ اسمار حسنیٰ کی فارسی شرح ہے،

رسالہ حواس پنجگانہ۔ حواس پنجگانہ پر فارسی میں مختصر تصنیف ہے، یہ رسالہ اپنے مرید خلیفہ شیخ صدر جہاں دھارہ وال کی درخواست پر لکھا تھا۔[1]

رسالہ قبلۃ المذاہب۔ فارسی زبان میں اہل تصوف کے اشارات کی توضیح ہے،

حاشیہ بر شرح ضیائیہ۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے کافیہ پر جو شرح لکھی ہے، اس پر یہ شرح حاشیہ ہے، عبدالستار کے زمانۂ درس میں تصنیف کی گئی ہے، مولانا عبدالغفور برہانپوری اور مولانا عصام الدین کے حاشیوں کے مقابلہ میں اس کی زبان صاف وشستہ اور بیان میں دلکشی ہے، گلزار ابرار کے مصنف نے اس کتاب کی شیرینی بیان کی تعریف کی ہے،[2]

فتح محمدی۔ یہ کتاب فتح محمد کے لیے تالیف کی تھی،

تتمیم شرح مایۃ عوامل۔ اس کتاب کا آغاز فتح اللہ شیرازی نے کیا تھا، لیکن ان کی ناگہانی موت کے باعث نامکمل رہ گئی تھی، ان کے چچیرے بھائی میر سید علی کی درخواست پر حضرت مسیح الاولیاء نے اسکو پورا کیا،[3]

رسالہ عقود۔ ارباب حدیث ہاتھ کی انگلیوں سے جو گنتی شمار کرتے ہیں، اسمیں اس کا طریقہ بتلایا گیا ہے،

شرح رباعیات اسرار الوحی۔ اسرار الوحی سے متعلق دو رباعیوں کا ترجمہ اور انکی شرح ہے،

مجمع البحرین۔ اس کتاب کا ذکر صرف تاریخ برہانپور میں ملتا ہے، فارسی زبان میں ہے،

حاشیہ بر اشارات غریبہ۔ "اشارات غریبہ" انسان کامل۔ عبدالکریم جبلی کی تصنیف ہے، اشارات کی واضح اور عمدہ شرح ہے۔ یہ کتاب سید احمد دکھنی (خلیفہ حضرت شیخ وجیہ الدین علوی) کی شاگردی کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

رسالۂ دقیقہ۔[4] مختصر رسالہ ہے، اس میں تعینات اور حقیقت محمدیہ پر بحث کی گئی ہے، اشذرات

---

[1] گلزار ابرار قلمی ورق ۳۴۴ [2] ایضاً ۴۴۳ ب [3] ایضاً ۴۴۳ [4] رسالۂ دقیقہ کا احقر کو علم نہ تھا، اس رسالہ کے متعلق تمام معلومات حضرت سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد نے دی ہیں۔

کے طور پر ہر شذرہ میں کسی ایک "نوع" پر بحث ہے، اور ہر سرخی کا نام دقیقہ ہے، اور اسی رعایت سے اس رسالہ کا نام بھی دقیقہ ہے،

تفسیر انوار الاسرار۔ قرآن مجید کی یہ عجیب و غریب تفسیر عربی زبان میں ہے، اس کی وجہ تالیف کے سلسلہ میں فرحی نے لکھا ہے کہ حضرت موصوف کو قرأت، تجوید، نحو، معانی، بیان اور اصول وغیرہ پر اس قدر عبور حاصل تھا، اور معنوی نکات کا آپ کے اوپر اتنا غلبہ اور ہجوم رہتا تھا کہ فرماتے تھے کہ سننے والا متحمل ہو سکے تو جی چاہتا ہے کہ پورے قرآن پاک کی تفسیر سورہ فاتحہ میں بیان کردوں، یہ تفسیر اسی جوش و ولولہ کا نتیجہ ہے، اس تفسیر کے محض دو جزو کو دیکھ کر شیخ طاہر محدث نے کہا تھا کہ

"این چنین تفسیر را ممکن نیست کہ بے غوث و قطب کسے دیگر گفتن تواند"[1]

اس کی زبان عربی ہے اور عبارتیں مقفی، مسجع، مرصع اور اشعار سے مزین ہیں (یہ تفسیر اگرچہ صوفیانہ مذاق پر لکھی گئی ہے، لیکن موصوف کی نظر حدیث، روایت اور لغت پر بھی ہے، مثلاً الریح العقیمہ کی تفسیر میں ہے،

الریح العقیم الدبور، سماها عقیما لانها اهلکته وقطعت دابرهم وقیل لابرکة فیها ولایاتی بخیر وفی البخاری نصرت بالصبا واهلکت عاد بالدبور، اولانها خربت دیارهم واعدمت آثارهم من قولهم الهلاک وعقیم یوم القیمة لانه لایوم بعده

اختلاف قرأت سے بھی اعتنا کیا گیا ہے، ہر سورہ کی ابتدا میں اسی سورہ کی مناسبت سے بسم اللہ کی تضمین کی ہے، مثلاً سورہ طور کی اس طرح تضمین کی ہے،[2]

بسم اللہ الجامع المتجلی بالطور الرحمٰن بالکتاب المسطور الرحیم بالرق المنشور

---

[1] کشف الحقائق ورق ۱۱۴ [2] قوسین میں مندرج عبارت حضرت راشد کے کرم نامہ سے ماخوذ ہے۔

سورۂ رحمٰن کی تضمین میں ہے

بسم اللہ الجامع المتجلی بالتعین الاول والانسان الرحمن بتعلیم البیان الرحیم بقولہ لمن خاف مقام ربہ جنتان

اس میں تفسیر عراقی کی اعباسی سلمی، مجمع البحار، معالم، جامع البیان وغیرہ کے حوالے بھی موجود ہیں،

اس تفسیر میں بعض بعض آیات کی کئی کئی توجیہات بیان کی ہیں، عاقل خاں رازی نے ثمرات الحیات[1] میں لکھا ہے کہ حضرت برہان الدین راز الٰہی نے آیات متشابہات کی تفسیر کے ضمن میں بتلایا ہے کہ تفسیر انوار الاسرار میں "آیۂ کریمہ یا ایہا الذین آمنوا آمنوا باللہ" کی نو سو وجوہ بیان کی ہیں۔

عین المعانی ۔ یہ نادر روزگار تصنیف اوراد و وظائف سے متعلق ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ کی بسوط شرح ہے، اس کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ سنہ ۹۹۰ھ میں برہانپور میں

"روزے یکے از بجت شعار با خلاص رسالہ روضۃ الحسنیٰ فی شرح اسماء الحسنیٰ کہ مختصر از مؤلفات ایں ضعیف است، درسہ حافظ سمت تحریر یافتہ بود آورد و آغاز نوشتن کرد، ایں ضعیف بارادۂ آں کہ در کتابت ایں رسالہ مشاغلت نمودہ و اعانت نماید اوراق از دست او گرفتہ سطرے چند در نوشت۔ بعضے معنی جدید و رحین کتابت در خاطر وارد گشت و در مقرباں شد کہ معنی ثانی از معانی اولی دلنشیں می نماید و می شاید کہ ایں نوع از یں نوع عین حکمت حکیم است کہ زمام قلم اعلیٰ قلم اسفل بدست مشیت و انگشت ارادت او تسلیم داعیہ دعوت وقت آں خواند کہ شرحے دیگر ہم باسلوب غریب بہ نظم و نثرے باید نوشت پس بیارے تے کہ مقدور و استطاعت او بود متصدی انگشت۔

انہ علی ما یشاء قدیر و بالاجابت جدیر

آغاز کتاب سے قبل تیس فصلیں ہیں، ہر فصل میں تصوف کے متعلقات پر بحث ہے، اس کے بعد

[1] ثمرات الحیات ورق ۵۰

کتاب شروع ہوتی ہے، ہر ایک اسم الٰہی کے لغوی و اصطلاحی معنی اور اس کے اوصاف و خواص کو دل نشین طریقہ پر سمجھایا گیا ہے، اور اس اسم کا ایک لطیف معما شعر میں پیش کیا ہے، پھر ان کے وظیفہ کے اعمال اور سالکین کے لیے ہدایات تحریر کی گئی ہیں، اور جابجا لطیف اشعار نگینہ کی طرح جڑے ہیں، جس سے خشک اوراد و وظائف کی یہ کتاب بڑی دلکش ہوگئی ہے،

مرثیہ ۔ مرثیہ کا یہ نایاب و نادر نسخہ کتب خانہ درگاہ راز الٰہی برہانپور میں محفوظ ہے، اسکے عنوانات تمام تر فارسی میں ہیں، زبان میں پنجابی کا اثر نمایاں ہے، اس مرثیہ میں ۴۴ بند ہیں، ہر بند میں ۸ شعر اور آخر میں ایک دوہرہ ہے، شروع میں حضرت شاہ عیسیٰ کی تعریف ہے،

عیسن شاہ مہا گر گیانے — جاکے گت کنوں نہیں جانے

نین میں جوں نبی ہمارے — یو دلین میں عیسن پیارے

اس کے بعد شاہ لشکر محمد عارف کے مراسم عرس کی تفصیلات ہیں، پھر اپنی "طلب آرائش بہشت، حضرت محمد غوث اور شاہ لشکر کی خانقاہ میں آپ کی آمد، مریدوں اور انکے لڑکوں میں اضطراب کا ذکر ہے، اس کے بعد حضرت کے وصال، تجہیز و تکفین کے حالات اور اطراف و جوانب خصوصاً اہل لاہور کے ماتم، مصنف کے سوز وگداز، حضرت موصوف کی روح کے جنت میں جانے اور وہاں دیدار الٰہی سے مشرف ہونے کا تذکرہ ہے، اس طرح یہ طویل مرثیہ ذیل کے بند پر ختم ہوتا ہے۔

کیا کوئی جانے گر کے باتا — بے دو یک پیہ کے رنگ راتا

واکے گت واہی نہیں جانے — اور کوئی کیا وہ پچھانے

مورکھ لوگ کٹھن بہیو ہیا — مواج نکھیں کہیں مرثیا

مرثیا کیوں کہیو جائے — کور سلتا جار سمند سمائے

کور سلتا ہر سمند سمانے — جیون مصری بھل جا پچھانے

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکتوباتِ گیلانیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

حیدر آباد دکن،

۴ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ

سیدی الامام دمتم بالعافیۃ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کو تو خط لکھتے ہوئے بھی جی ڈرتا ہے، کچھ نہیں تو کم از کم یہی اعتراض سہی کہ "خط غبار" کا خط تھا، امید ہے کہ آپ بعافیت اپنے اہل بیت میں پہنچ گئے ہوں گے، ہم لوگوں کا اسی عالمِ مسافرت میں جو تھا روزہ ہے، آپ کے جانے کے بعد تیسرے دن یکایک ایک خبر ہم لوگوں کو ملی کہ آپ کے متعلق اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ کا کوئی فرمان اقدس شرف صدور لایا ہے، اس وقت دفاتر بند ہو چکے تھے، دوسرے دن شہر ہی میں معلوم ہوا کہ وہ فرمان آیا ہے، میں نے اور مولوی عبد الباری صاحب نے پڑھا، غالباً اصل فرمان کی نقل آپ کو مولوی صاحب بھیجیں گے، میں تو اس وقت جناب کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں، اور دیکھئے کہ جب ملنے کا ارادہ نہ تھا تو ملنے کا کیا عجیب سامان ہوا، اور بحمد اللہ ملاقات جتنی بار ہوئی اس سے پیشتر کی کوئی ملاقات ایسی ثابت نہ ہو سکی، افسوس ہے کہ سرکار کے سامنے تمام واقعات اپنے اصلی شکل میں نہ تھے، اور اس سے انھوں نے یہ خیال فرمالیا کہ تین سو روپے تو ان کو مل ہی رہے ہیں، اس میں سو کلدار کا اور اضافہ کیا جائے

گویا ان کے خیال میں آپ کا وظیفہ اب چار سو ہے، لیکن واقعہ کے اعتبار سے یہ سو ہی روپیہ ہوا کل ہم لوگ متعدد لوگوں سے اس باب میں مشورہ لینے کے لیے دوڑے، خود ہوش صاحب کے پاس بھی گئے، سب کی رائے یہی ہوئی کہ اس وقت اس سو کی منظوری کونسل سے حاصل کر لینی چاہیے، اور بقیہ سو کے لیے اس وقت جد وجہد کیجائے، جب سیرت کی اعانت کا مسئلہ درپیش ہوگا، یعنی اس کی توسیع کا، مینائی صاحب کی تحریک مسل میں موجود ہے کہ سیرت کی امداد آپ کے نام شخصی طور پر منتقل کر دیجائے، اسی کو بنیاد بنا کر انشاء اللہ اس وقت اس مسئلہ کو چھیڑا جائے گا،

ہوش صاحب فرماتے تھے کہ آپ سے ملنے کے بعد دو تین دن تک تقریباً زیادہ وقت آپ ہی کے ذکر وفکر میں گذرا، سیرت جلد پنجم نظر مبارک سے نہیں گذری تھی، ہوش سے منگوائی گئی، آجکل زیر مطالعہ ہے، اور داد وتحسین مل رہی ہے، اور کیا عرض کروں، مجھے اس کا افسوس ہوا کہ آپ حضرات نے میرے اس حقیر مضمون ہی کو سہی لیکن بہرحال جس کی طرف اس کا انتساب تھا، وہ تو خالی تھا، آپ لوگوں نے غور سے نہیں دیکھا، خدا جانے اس پر بھی آپ کو کھجانے نے کچھ موقع دیا یا نہیں، تین دن تک ہم لوگوں کو سخت خوف ہوا کہ اب حملہ ہوا تب ہوا، لیکن لائف ہاتھ سوپ کی جو بٹی رہ گئی تھی، اس سے ایک دو دفعہ غسل کر لیا، اب خارشت کا پتہ نہیں چلتا، ورنہ دو دن تک تو یقین ہو چکا تھا کہ آخر مجھے بھی ہو گئی،

آپ کو اس صابن سے کچھ نفع ہوا یا نہیں، اس صابن کی ایک اعلیٰ قسم بھی ہے، "ٹائلٹ لائف بائے سوپ" اگر اس سے نفع نہ محسوس ہوا ہو تو اسی کو منگوا کر دیکھیے،

آپ کے اخباروں میں "معلومات عامہ" کیجانب سے آپ کی اور نواب مہدی یار جنگ بہادر کی پوری تقریر دائرۃ المعارف والی شائع ہوئی ہے۔

نیاز مند مناظر احسن

ہاں اشد ضروری سلسلہ کی ایک بات رہی جاتی ہے، ہوش صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ نے عند التذکرہ یہ جو فرمایا تھا کہ فوق بلگرامی نے اپنی کسی کتاب میں آپ کے کسی مضمون کو بعینہ نقل کر کے اپنی طرف منسوب کیا ہے

اس پتہ کس طرح چلے گا، منقول فیہ اور منقول عنہ دونوں کتابوں کا پتہ بصیغۂ اشد ضروری خود ہوش صاحب کو لکھ کر بھیجدیجئے، اور ان کو آپ ایک خط شکریہ کا بھی لکھیے، سچی بات یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا بظاہر حق تعالیٰ نے ہوش صاحب ہی کو اس کا ذریعہ بنایا،

۲

سیدی الامام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گذشتہ "فاجعہ الیمہ" کے موقع پر باوجود انتہائی جد وجہد کے دیسنہ حاضر نہ ہو سکا، اس نے ایسا شرمسار کیا ہے کہ پھر ہمت نہ ہوئی کہ تحریر کی شکل میں فریضۂ تعزیت ادا کروں، صبر و استقامت کی دعا ہی پر قناعت کرتا رہا کہ ادھر مولانا عبد الباری صاحب کے نام جو گرامی نامہ شرف صدور لایا، اس سے آپ کی اور آپ کی اہلیہ کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا، اور اس کے ساتھ اس عالم کمزوری میں اعظم گڈھ، پٹنہ، دسنہ، مظفر پور کی تگ و دو کا حال معلوم ہوا، عجیب بات ہے، حق تعالیٰ اپنے مخلصین کے لیے تکفیر و تطہیر کا اعلیٰ نظم اسی دنیا میں فرماتے ہیں، تاکہ جب دار باقی میں وہ پہنچیں تو پاک وصاف پہنچیں، پچھلا حادثہ اگرچہ آپ کے لیے جانگداز اتنا نہ ہو، لیکن آپ کے گھر کے لیے بہر حال ماں کا واقعہ ہے، آپ کا اپنی لڑکی سے جدا ہونا اور ان کا اپنی ماں سے جدا ہونا، کیفیت کے لحاظ سے دونوں کا پلہ برابر ہے، لیکن جوان مرگی کی تلافی کس واقعہ سے ہو سکتی ہے، میں نے مرحومہ کے انتقال کی خبر گیلانی میں یکایک سنی، آپ کے ساتھ دو دفعہ پٹنہ حاضر ہوا، بیماری کی کوئی خبر نہ تھی، کہ یکایک یہ خبر ملی، بعد کو معلوم ہوا کہ شاید وہ کچھ دنوں سے بیمار تھیں، بہر حال اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے گھر کے لوگوں کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے سرفراز فرمائے۔

مولانا عبد الباری صاحب ہی کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خاکسار کی "ژولیدہ نوائی" نے سامعہ ہمایونی تک پہنچنے کی بھی سعادت حاصل کی، کئی دفعہ میرا خود ارادہ ہوا تھا کہ خدمت والا میں

کسی خط کے ساتھ اس کو بھیجوں، لیکن گذشتہ ندامت ہمیشہ دامن کش ہو جاتی تھی، اس خط میں شبلی کا ایک پھول بھی تھا، جو دیوانے منصور کے سر پر مارا گیا ہے، یہ ایک عاجلانہ مضمون تھا، جس نے کتاب کی شکل اختیار کی، کچھ تو طباعت کی ناقابل عفو غلطیاں پھر بھی رہ گئی ہیں، نیز قصداً بھی اس رسالہ کو اس لیے تیار کیا گیا تھا کہ جس طرح عیسائی اسٹیشنوں پر انجیل و زبور کے ترجمے فروخت کرتے ہیں، ریل کے مسافروں کے لیے ایک "اسلامی مشغلہ" اس کے مقابلہ میں تیار کیا جائے، اسی لیے عمداً اس کی زبان کچھ انجیل سی ہو گئی ہے، واقعات میں بجائے بین ترتیب کے ایسی ترتیب رکھی گئی ہے کہ "ربط فقرات" میں کچھ وقت صرف ہو، اب میں خود جب پڑھتا ہوں تو اس متن کے لیے شرح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، بھلا اس صورت میں آپ نے اس کو غور سے استیعاباً کیا پڑھا ہوگا، لیکن میری تمنا تھی کہ ایک آدھ نظر اس حیثیت سے اس پر ضرور ڈالی جائے کہ واقعات میں علت و معلول کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے، کہاں تک درست ہے، دفع و خل مقدر کے سلسلہ میں بھی آپکی نظر کے محتاج تھے، غزوات و سرایا، ازواج مطہرات، مدنی زندگی کی سیاست، تحویل قبلہ وغیرہ کے اسرار، میں چاہتا ہوں کہ کوئی جاننے والا ان کو پڑھتا اور ہوتا کوئی خدا کا بندہ جو مجھے نیک مشورہ دیتا، اور کیا عرض کروں، جی رہا ہوں، جب تک ان حالات میں جینا ہے "ہندوستانی" کے لفظانے مبارک ہو کر حسن قبول کا تمغہ حاصل کیا، جزاک اللہ، حیدر آباد کا قصد کب تک ہے، مناسب تو یہی ہے کہ جلد ششم کے ساتھ تشریف فرمائی ہو، اور سنیئے آپکے قدیم دوست مفتی عبد القدیر البدایونی نے آپ کی کتاب الجنایات کو مسترد ٹھہرایا ہے، تفصیل پھر کبھی،

مناظر احسن گیلانی

(۳)

سیدی و سید المسلمین دمتم بالہناء والعافیۃ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مکتوب گرامی کے جواب میں رسید کا کارڈ مل گیا ہوگا، میں تفصیلی جواب دینا ہی چاہ رہا تھا کہ ایک اور ضرورت

بھی پیش آگئی، واقعہ یہ ہے کہ ہوش صاحب ان دنوں کچھ بیمار ہیں، ایک دن انکی عیادت کے لیے گیا ہوا تھا معلوم ہوا کہ آرام فرما رہے ہیں، واپس چلا آیا، بعد کو ان کا ایک ضروری مکتوب ملا کہ مجھسے تم اور عبدالباری صاحب فوراً ملیں، رات گیا تھا، بیچارے ابتک فرش ہیں، الوان نعم کا کھانے والا صرف خشک توس کے دو ٹکڑے اور ایک سفید سا پانی جسکی تشبیہ انھوں نے خود "بول حمار" سے دی، انکے سامنے رکھا ہوا تھا، برا بھلا کہتے جاتے تھے اور لقمہ حلق میں اتار رہے تھے، بہرحال ملنے کے بعد فرمایا کہ ضرورت یہ پیش آگئی ہے کہ مولانا نے اعلیحضرت کے مضمون کے متعلق میری فرمایش سے جو کچھ لکھکر بھیجا ہے، بہت اچھا تھا لیکن ناواقفیت کیوجہ سے آخر میں انھوں نے کجکلاہ ایران کا بھی ذکر اس شخص کے سامنے کر دیا، جو اپنے سوا کسی سر پر کلاہ دیکھنا نہیں چاہتا، انھوں نے وہ خط مجھے واپس کر دیا ہے کہ آپ تک پہنچا دوں، اور اسی خط کو دوبارہ بحذف حصۂ آخری انکے نام بعجلت ممکنہ روانہ فرمایئے، اسی کے ساتھ انھوں نے ایک دوسرا مضمون بھی اظہار رائے کی غرض سے دیا ہے، اس کا تراشا بھی اسی لفافہ میں بند ہے، اسکے متعلق ایک الگ رائے قلم بند فرما کر ہوش ہی صاحب کے نام روانہ فرما دیجیے۔

مولانا مسعود علی الحاج کی واپسی سالماً غانماً الحمدللہ ہو گئی، حق تعالیٰ کے انعامات جو انکے حال پر ہوئے سنکر مسرت بھی ہوئی، اور تھوڑا رشک بھی ہوا، برنی صاحب نے اس قسم کے حضرات کا نام شکریوں رکھا ہے، جی چاہتا ہے کہ تبریک و تہنیت کے لیے اعظم گڈھ اترتے ہوئے وطن جاؤں لیکن گھر سے خطوط ایسے مشوش آرہے ہیں کہ بچے اور خود مکارم سلمہ کی طبیعت خراب ہے، خدا کرے یہ لوگ اچھے ہو چکے ہوں، ورنہ مجھ بعجلت ممکنہ مجھے گیلانی جانا پڑیگا، مولانا الحاج کو میرا سلام فرما دیجیے، حسب الحکم "جمعیۃ التمدن الاسلامی" کے کاغذات پر دستخط وغیرہ کرکے واپس کر دیا ہے،

اور کیا عرض کروں، حیدرآباد اپنے آخری نازک عہد سے گذر رہا ہے، نہ کوئی دماغ ہے اور نہ کوئی دل جو اسوقت اسکے جہاز کو منجدھار سے پار نکالے، حیدری صاحب تنہا ایک جاندار آدمی ہیں لیکن وہ بھی دل سے محروم ہیں، اور اسوقت دماغ سے زیادہ دل کی ضرورت ہے، اب مسلمانوں کے اس آخری پارۂ نان کا خدا ہی حافظ ہے، اخبارات وہ سب کچھ آپکو سناتے ہی رہتے ہونگے، جو ہم دیکھتے ہی رہتے ہیں، واللہ خیر حافظا،

مولانا عبدالباری ندوی اگرچہ اب مجھ سے الگ ایک مسجد کی حجرہ میں رہتے ہیں، لیکن الحمدللہ جوار کا شرف اب بھی حاصل ہے، کالج کی آمد و رفت ساتھ ہوتی ہے، سلام فرماتے ہیں،

نیازمند مناظر احسن گیلانی حیدرآباد دکن ۱۴ مارچ ۱۹۳۹ء

ادبیات

غزل

از

جناب شاہ ولی الرحمن صاحب کاکوی ڈپٹی کلکٹر

طلسم غیب ہے عالم یہاں شہود کہاں
تمام راز ہے، اس راز کی نمود کہاں

جمال یار کو ہے اضطراب جلوہ گری
جبین شوق میں بیتابی سجود کہاں

مرا وجود ہی خود گم ہے تیرے جلوے میں
زبان شوق کو اب فرصت درود کہاں

اگر ہے شعلہ سلامت، دھواں بھی آگ بھی ہے
ہوا جو راکھ تو پھر التہاب و دود کہاں

خیال سود ہٹا دے، یہی ہے راز حیات
زیاں کدے میں جہاں کے نصیب سود کہاں

بکھر گئی جو وہ کاکل، شمیم پھیل گئی
سنور گئی جو کہیں بوئے مشک و عود کہاں

مرا وجود ہے اے حسن تیرے جلوے سے
اگر ہے تو پس پردہ مرا وجود کہاں

ہے جاوداں جو سفر، سامنے ہو منزل شوق
مسافروں کے لیے رخصت قعود کہاں

ہنوز زندہ ہے جاوید نامۂ اقبال
مگر جہاں میں دلہائے "زندہ رود" کہاں

غزل

از جناب چندر پرکاش صاحب بجنوری

راس جب آگئی خلوت دل مجھے
وہ نظر آئے محفل بہ محفل مجھے

پردہ اٹھا مگر حیرت دیدنے
کر دیا یک بیک خود سے غافل مجھے

ڈال کر اک نگاہ سکوں آفریں — کوئی سمجھا گیا مقصد دل مجھے

اللہ اللہ رہ عشق کا معجزہ — ہر بگولہ نظر آیا محمل مجھے

اے خوشا زندگی محبت خوشا — مل گیا میری الفت کا حاصل مجھے

ہوگئی اور آسان راہ طلب — مل گیا جب کوئی رہبر دل مجھے

قابل شکر ہے میری بے مائگی — اس نے سمجھا تو شایانِ محفل مجھے

مجھکو راس آگئی میری گم گشتگی — مل گئی خود بخود میری منزل مجھے

اٹھ کے جوہر کوئی میرے آغوش سے — دے گیا آہ تنہائی دل مجھے

غزل

از جناب نظر شاہجہانپوری

کچھ دنوں اور بہلا لے دل ناکام ابھی — اپنے قبضے میں نہیں گردش ایام ابھی

پھول خنداں تو ہوئے لاکھ چمن میں لیکن — موسم گل کو ترستے ہیں در و بام ابھی

بے خبر توڑ کے دیوار قفس ناز نہ کر — جا بجا اور بھی پھیلے ہیں کوئی دام ابھی

اتنی مہلت ملے کر لوں غم دوراں کا علاج — ہم نفس اور نہ دینا کوئی پیغام ابھی

بوالہوس ہوگئے ارباب نظر میں شامل — آپ یوں ذوق تماشا نہ کریں عام ابھی

تشنہ لب ہیں تجھے ساقی یہ غلط فہمی ہے — ہم جو جاہیں تو چھلکتے ہوئے سو جام ابھی

اتنا احساس تجھے چاہیے اے برق جمال — دل ابھی تشنۂ طلب ذوق نظر خام ابھی

جگمگانے تو لگا عالم ہستی لیکن — میری دنیا میں سحر ہے کہ وہی شام ابھی؟

اے نظر کشمکش دہر نہیں ہے کافی
زندگی کے لیے کچھ اور بھی الزام ابھی

مطبوعات جدیدہ

مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب } مترجمہ پروفیسر محمد سرور صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۹۸ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عمر، پتہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور

ہنگری کے مشہور مستشرق پروفیسر عبدالکریم جرمانوس ہندوستان کے لیے اجنبی نہیں ہیں، وہ شانتی نکیتن اور جامعہ ملیہ میں بھی رہ چکے ہیں، ان کو اسلام اور اسلامی علوم سے اس قدر شغف ہے کہ اس کے اثر سے مسلمان ہوگئے، اور حج کے شرف سے بھی مشرف ہوئے، اس لیے ان کو مسلمانوں کے مسائل سے خاص دلچسپی ہے، چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر ایک کتاب لکھی ہے، مذکورۂ بالا کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے، اس میں اسلامی تاریخ اور یورپ کی ترقی کی روشنی میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بحث کی ہے اور ان کی ترقی کے وسائل بتائے ہیں، بعض دوسرے مستشرقین اور مسلمان مفکرین نے بھی اس مسئلہ پر لکھا ہے، مگر امیر شکیب ارسلان کی کتاب کے علاوہ کوئی بھی افراط و تفریط سے خالی نہیں ہے، پروفیسر جرمانوس مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ سے پوری طرح واقف ہیں، اور یورپ کی تمدنی ترقی کی تاریخ پر بھی ان کی نظر ہے، اور وہ مسلمانوں کا درد بھی رکھتے ہیں، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ان کی ترقی کے وسائل پر بڑی حد تک صحیح نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، اور ان کی بیشتر رائیں صحیح ہیں، لیکن بعض خیالات میں مغربی انداز فکر نمایاں ہے، اور ان کو اسلام کے ساتھ مطابقت دینے میں کہیں کہیں تضاد پیدا ہوگیا ہے، چنانچہ ان کے نزدیک بھی مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ

مغربی علوم اور مغربی تنظیمات کو انھوں نے قبول نہیں کیا، اور اس کا علاج یہ ہے کہ ان کو قبول کرلیا جائے، مگر وہ اسلامی تعلیمات کو بھی چھوڑنے کا مشورہ نہیں دیتے، ان کو ان کی خوبیوں کا اعتراف ہے، وہ یورپ کی اندھی تقلید کو بھی مضر اور اسلامی و مشرقی روایات کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ بعض شرعی قوانین کو اس ترقی یافتہ زمانہ کے لیے ناقابل عمل سمجھکر ان کے ترک کا مشورہ دیتے ہیں، اور اسلامی قومیت کے بجائے یورپ کی جغرافی نیشنلزم کو ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، اس قبیل کے بعض اور خیالات بھی ہیں، مگر ان سے قطع نظر مصنف نے بڑی حد تک مسلمانوں کے زوال کے اسباب کا صحیح تجزیہ کیا ہے، اور ان کی ترقی کے بارہ میں بھی ان کے مشورے صحیح، معقول اور غور و فکر کے لائق ہیں، جہاں تک یورپ کے علوم و فنون، سائنس، آرٹ اور حکومت کے نظم و نسق وغیرہ کا تعلق ہے، ان میں یقیناً بہت سی چیزیں مفید اور قابل تقلید ہیں، اور ان میں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات میں کوئی تناقض بھی نہیں ہے، اور وہ بڑی حد تک اسلامی ملکوں میں رائج بھی ہو چکی ہیں، حتیٰ کہ سعودی عرب تک اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، تضاد درحقیقت اس ترقی و تہذیب کے مادی تصور اس کے نصب العین اور نتائج میں ہے، جس میں خدا شناسی اور اخلاق و روحانیت کا کوئی وجود نہیں، اور جس کی غرض و غایت خالص مادی منفعت اور دنیاوی تعیش ہے، ورنہ محض دنیاوی ترقی کے مادی وسائل، یورپ کے علوم و فنون اور ان کی تنظیمات کو جن کا اسلام سے کوئی تصادم نہیں ہوتا، اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ مسلمانوں کی بقا کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے، اور ان وسائل کو آج پوری دنیائے اسلام اختیار کر چکی ہے، اور اختیار کرتی جاتی ہے مگر اس کے باوجود وہ اب تک پسماندہ ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب مادی سے زیادہ اخلاقی ہیں، وہ ان اوصاف سے عاری ہو گئے ہیں جو نہ صرف دینی بلکہ دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی قوموں کی موت و حیات موقوف ہے، اور جو ہر قوم و ملت کی سربلندی کے لیے ضروری ہیں، ان اوصاف کے بغیر کوئی قوم محض مادی وسائل کے ذریعہ ترقی نہیں کر سکتی، بلکہ مادی وسائل کی کامیابی بھی ان ہی اوصاف پر موقوف ہے، مسلمانوں نے اسی کے سہارے ترقی کی تھی، اور اسی کے فقدان سے زوال و پستی میں مبتلا ہوئے، اس کے مقابلہ میں ان میں وہ ساری کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں، جو قوموں کے لیے پیام موت ہیں، اس لیے مسلمانوں کی ترقی کے لیے مادی وسائل سے زیادہ ان کے اخلاق و سیرت کی اصلاح کی ضرورت ہے، تاہم مصنف نے اخلاص و حسن نیت سے یہ کتاب لکھی ہے، اور اس میں بہت سی مفید اور کارآمد باتیں ملتی ہیں، کتاب کے شروع میں مترجم کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس کی حیثیت گویا تائیدی نوٹ کی ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔

سلاطین ہند کی علم پروری

از جناب محمد حفیظ اللہ صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۸ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۶ غیر مجلد ۵، پتہ مسلم اکیڈمی، پھلواری شریف، پٹنہ،

علم پروری اور علما نوازی مسلمانوں کی نمایاں خصوصیت رہی ہے، انھوں نے جس ملک میں بھی قدم رکھا اس کو علم کی روشنی سے منور کر دیا، اس لیے ہندوستان کے مسلمان سلاطین کے بھی بڑے علمی کارنامے ہیں، بلکہ ہندوستان کا علمی دور صحیح معنوں میں مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا، اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی علم پروری کے حالات تحریر کیے گئے ہیں، کتاب کے شروع میں ان کی علم پروری پر اجمالی تبصرہ ہے، اور اس کے بارہ میں غیر مسلم علماء و مصنفین کے بیانات نقل کیے گئے ہیں، اس کے بعد سندھ کی ابتدائی اسلامی حکومت سے لیکر حیدرآباد کی آصفی حکومت کے خاتمہ تک تمام حکمراں خانوادوں اور ان کے حکمرانوں کی علم پروری کے واقعات اور ان کی علمی خدمات لکھے گئے ہیں، اور یہ واقعات مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں، یہ موضوع بہت وسیع ہے، اور اس پر اس سے زیادہ جامع کتاب لکھی جا سکتی ہے، مگر مصنف نے اختصار ملحوظ رکھا ہے، تاہم اس سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی علم نوازی کا اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے۔

قانون شریعت حصہ اول و دوم } مؤلفہ جناب مولانا شمس الدین احمد صاحب جعفری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ترتیب ۱۹۷ اور ۱۷۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت

جلد اول عہ/ جلد دوم ۶/ پتہ ننھے میاں عالم گنج، جونپور،

اردو میں فقہی مسائل پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بہشتی زیور، مولانا عبد الشکور صاحب کی علم الفقہ اور متعدد مستند اور مفید کتابیں موجود ہیں، مصنف نے یہ نئی کتاب لکھی ہے، اس کی پہلی جلد میں عقائد، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور قربانی، اور دوسری جلد میں حج، نکاح، طلاق، بیع و شراء اور دوسرے معاملات و اخلاق کے مسائل ہیں، اس طرح یہ کتاب ضروری مسائل پر حاوی ہے، یہ مسائل زیادہ تر فقہ کی معتبر و مستند کتابوں سے لیے گئے ہیں لیکن بعض نام غیر مانوس بھی نظر آتے ہیں، عقائد میں غیر ضروری باتیں بھی لکھی ہیں، یہ زمانہ اعجوبہ پرستی اور عقائد کے طومار کا نہیں ہے، اس سے فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے، آجکل بنیادی اور ضروری عقائد کی تعلیم کافی ہے۔

حیرت زار - مرتبہ پروفیسر سید عطاء الرحمٰن صاحب عطاؔ کاکوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۸۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ/ ۱۲، پتہ ایوان اردو، پٹنہ نمبر ۴

مرزا عبد القادر بیدل فارسی کے ان صاحب طرز شعراء میں ہیں جو ایک خاص رنگ کے موجد بھی تھے، اور خاتم بھی ان کا کلام بڑا عارفانہ و حکیمانہ اور تخیل، ندرت و نزاکت کے لحاظ سے بڑا دلکش ہوتا ہے، مگر دقت آفرینی نے اس کو نہایت عسیر الفہم بنا دیا ہے، لیکن خیالات اور طرز ادا دونوں کے لحاظ سے اس میں اتنی ندرت و رفعت ہے کہ غالب اور اقبال جیسے شعراء نے اس کی تقلید اور اس سے استفادہ کیا ہے، حیرت زار ان کے کلام کا انتخاب ہے، اس میں مختلف اصناف کا بڑے سلیقہ اور حسن مذاق سے انتخاب کیا گیا ہے، جس سے بیدل کی خصوصیات کا اندازہ ہو جاتا ہے، کتاب کے شروع میں بیدل کے حالات کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے مضامین اور تاثرات ہیں جس سے بیدل کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

"ض م"

جلد ۷۸ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۶ء عدد ۴

فہرست مضامین